پرتاپ گڑھ کی اسلامی تاریخ

عہد بہ عہد

مرتب

محمد قاسمی پرتاپ گڑھی

استاذ ونگراں مدرسہ انوار القرآن

شاخ دار العلوم دیوبند، سترکھ، بارہ بنکی

مرکز الشیخ مولانا محمد یار رح

مولانا نگر، اوگئی پور، سگرا سندر پور، پرتاپ گڑھ (یوپی)

إِنَّ الْأَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ط

(بلاشبہ یہ زمین اللہ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے
جسے چاہتا ہے اس کا وارث بنادیتا ہے۔)

پرتاپ گڑھ کی اسلامی تاریخ

عہد بہ عہد

مُرتّب

محمد قاسمی پرتاپ گڑھی

ناشر

مرکز الشیخ مولانا محمد یارؒ

مولانا نگر، اوگئی پور، سکرا سندر پور، پرتاپ گڑھ (یوپی)

جملہ حقوق بحق مرتب محفوظ ہیں۔

تفصیلات

نام کتاب : پرتاپ گڑھ کی اسلامی تاریخ عہد بہ عہد

مرتب : محمد قاسمی پرتاپ گڑھی

تعداد : چھ سو

اشاعت : مئی ۲۰۲۳ء

صفحات : ۲۱۶

ناشر : مرکز الشیخ مولانا محمد یارؒ

مولانا نگر، اوگئی پور، سکرا سندر پور، پرتاپ گڑھ (یوپی)

رابطہ نمبر : 9766163919

ملنے کا پتہ : مکتبہ النور دیوبند 9456422412

انتساب

●

والد ماجد مصلح ملت حضرت مولانا محمد یار صاحب قدس سرہ العزیز کے نام۔
یہ کتاب درحقیقت اسی ذات والا صفات کی علمی وفکری
اور روحانی مجالس کی باد بہاری ہے۔
اے باد! نسیم یار داری زآں نفخۂ مشکبار داری
ترجمہ: اے ہوا تیرے پاس یار کی خوشبو ہے۔
اسی وجہ سے تیری خوشبو مشکبار ہے۔

●

والدہ ماجدہ ادام اللہ ظلہا علینا کے نام، [1]
جن کی بے پایاں شفقت، محبت اور شب وروز کی دعائیں حاصل زندگی ہے۔

فبحبک راحتی فی کل حین
وذکرک مونسی فی کل حال

ترجمہ: ہر گھڑی تیری محبت میری راحت ہے۔
اور ہر حال میں تیرا ذکر میرا مونس ہے۔

---

[1] افسوس کہ راقم الحروف مؤرخہ ۵/ ذو القعدہ ۱۴۴۴ھ مطابق ۲۶/ مئی ۲۰۲۳ء کو عین وقت جمعہ اس سایۂ رحمت ورافت سے محروم ہوگیا۔ مشیت ایزدی کے سامنے بے بس ولاچار، رضا بالقضاء کے سوا چارۂ کار نہیں۔ تاہم رہ رہ کر اندر سے ایک ہوک اٹھتی ہے، تو اقبال کے یہ اشعار سامانِ حسرت بن کر نڈھال کر دیتے ہیں۔

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ میرا انتظار ● کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بیقرار
خاک مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا ● اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا
عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی ● میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی

برد اللہ مضجعہا واجعلہا من المغفورین وادخلہا فی جنتک جنۃ الفردوس. آمین

فہرست

عنوان	صفحہ

دعائیہ کلمات

محدث جلیل ادیب شہیر حضرت مولانا عبدالخالق صاحب مدراسی دامت برکاتہم
استاذ حدیث ونائب مہتمم دارالعلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد لولیہ والصلوۃ علی نبیہ، امابعد:

’’پرتاپ گڑھ کی اسلامی تاریخ عہد بہ عہد‘‘ عزیزم مولوی محبوب الٰہی محمد پرتاپ گڑھی کی ترتیب دادہ ہے۔ جس میں موصوف نے ضلع پرتاپ گڑھ (یوپی) کی جغرافیائی، سیاسی، معاشی اور اسلامی تاریخ کو تفصیل سے مع حوالوں کے بیان کیا ہے۔

ضمناً ماضی قریب کے ان بزرگان دین وعلمائے اسلام کے حالات زندگی پر بھی مختصر روشنی ڈالی ہے، جن کی دینی وملی خدمات کے تابندہ نقوش اس علاقے کے چپے چپے پر ثبت ہیں۔ کتاب اپنے مشمولات کے اعتبار سے جامع اور ایک تاریخی دستاویز ہے۔

اللہ رب العزت اپنے فضل وکرم سے موصوف کی اس خدمت کو قبول فرمائے اور مزید علمی ودینی کام کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ (آمین)

(حضرت مولانا) عبدالخالق صاحب مدراسی (زید مجدہم)
استاذ حدیث وادب دارالعلوم دیوبند
۲۶/۵/۱۴۴۴ھ - ۲۱/۱۲/۲۰۲۲

تحسین وتبریک

شاعر اسلام، نامور محقق و ناقد محترم جناب ڈاکٹر تابش مہدی صاحب

مولانا محمد قاسمی پرتاپ گڑھی نئی نسل کے ایک ذہین وفطین، صالح و باعمل اور سنجیدہ عالم دین اور اہل قلم ہیں۔ گرچہ وہ درس وتدریس سے وابستہ ہیں، دارالعلوم دیوبند کی شاخ ''مدرسہ انوارالقران'' سترکھ ضلع بارہ بنکی یوپی کے وہ سربراہ ہیں، لیکن تصنیف وتالیف اور وعظ وخطابت سے بھی انہیں طبعی ومزاجی مناسبت ہے، قوم وملت کی اِصلاح ورہنمائی سے انھیں خصوصی دل چسپی ہے۔ اس سلسلے میں وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ سوچتے اور غور کرتے رہتے ہیں۔ اپنی اِس سرگرمی وفکرمندی کی وجہ سے جہاں بھی رہے ہیں مقبول ومحبوب رہے ہیں۔ میرا احساس ہے کہ اُنہیں یہ چیز ورثے میں ملی ہے۔ اُن کے والد محترم ہم سب کے ممدوح ومخدوم مصلحِ ملت حضرت مولانا شاہ محمد یارؒ پرتاپ گڑھی اپنے عہد کے جید علما و مصلحین میں تھے۔ پرتاپ گڑھ اور دوسرے قریبی اضلاع کے لوگ آج بھی اُن کی ملی واصلاحی کوششوں اور بے لوث دینی وتربیتی خدمات کو یاد کرتے ہیں۔ میں اُن کے نیازمندوں، نام لیواؤں اور عقیدت مندوں میں رہا ہوں۔ اُن کی شفقتوں، عنایتوں اور کرم فرمائیوں کو میں کبھی فراموش نہ کرسکوں گا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے اور ہم خردوں کو اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق دے۔

برادرِ عزیز مولانا محمد قاسمی پرتاپ گڑھی زمانۂ طالب علمی سے قرطاس وقلم سے اپنا رشتہ جوڑے ہوئے ہیں۔ تحقیق وتفحص اور تذکرہ وسوانح سے اُنھیں خاص شغف رہا ہے۔ ''تذکرہ علمائے پرتاپ گڑھ'' ان کا ایسا کارنامہ ہے، جو پرتاپ گڑھ کی علمی تاریخ میں

ہمیشہ اُنھیں باقی رکھے گا۔ اُنھوں نے اِس کام کے سلسلے میں کہاں کہاں کی خاک چھانی، کہاں کہاں کتب خانوں میں پہنچ کر ورق گردانی کی اور کن کن علمی و قلمی شخصیتوں سے ملاقاتیں کرکے، ان کی معلومات اور یادداشتوں سے استفادہ کیا، اِس کا صحیح اِدراک اُسی کو ہوسکے گا، جس نے اِس سلسلے میں کچھ کوچہ گردی کی ہو۔

زیرنظر کتاب ''پرتاپ گڑھ کی اسلامی تاریخ'' عزیز القدر مولانا محمد قاسمی پرتاپ گڑھی کی ایک اہم اور گراں قدر کاوش ہے۔ عزیز و فاضل مصنف کا یہ ایک ایسا کارنامہ ہے، جس کی ضرورت تو شدّت کے ساتھ محسوس کی گئی، لیکن قلم کسی نے نہیں اٹھایا۔ اگر کسی نے کبھی ہمّت بھی کی تو بس موضوع کی اہمیت اور ناگزیری کا اظہار کیا اور دو چار شُنیدہ اور ناتمام باتیں لکھ کر قلم ہاتھ سے گرادیا۔

زیرنظر کتاب میں مصنف نے سب سے پہلے بڑی تفصیل کے ساتھ پرتاپ گڑھ کا جغرافیائی تعارف کرایا ہے۔ اس کے بعد تحقیق و تنقید کے اُصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے، پرتاپ گڑھ کی قومی، ملّی اور سیاسی تاریخ پر کسی قدر معلومات افزا گفتگو کی ہے۔ اِس ذیل میں اُنھوں نے ہندوستان میں اسلام کی آمد اور عربوں کے اثرات کا بھی جامع تذکرہ کیا ہے۔ بعض مسلم حکمرانوں، ان کی مدّتِ کار اور اُن کے اندازِ حکمرانی کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ اِن چیزوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے بے شمار آخذ تک بھی رسائی حاصل کی ہے اور بعض تاریخ دانوں سے بھی استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

عزیز و فاضل مصنف نے پرتاپ گڑھ کی جغرافیائی اور تاریخی حیثیت پر گفتگو اور معلومات افزا بحث کے بعد وہاں رہنے اور بسنے والی سب سے قدیم مسلم برادری قریشی کو اپنی بحث و تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔ یہ برادری پورے ضلع پرتاپ گڑھ اور اس کے بعض قریبی حصّوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ اِسے بعض مورّخین اور تذکرہ نگاروں نے بنو ہاشم میں شمار کیا ہے اور ہاشمی یا قریشی الہاشمی کے لقب سے یاد کیا ہے۔ تاریخ نگاروں نے حضرت سیّد سالار مسعود غازیؒ کی جماعت سے بھی اِسے منسوب کیا ہے۔ اِس سلسلے میں بعض آثار و قرائن کی بھی نشان دہی کی ہے۔ امیر المومنین حضرت سیّد احمد شہیدؒ اور اُن کے

خانوادے کے رجل عظیم مجدّدِ عصر حضرت مولانا شاہ سیّد محمد امین نصیر آبادیؒ کی اِس برادری پر خصوصی توجہ رہی ہے۔ مصنف نے قریشی یا ہاشمی برادری سے حضرت سیّد نصیر آبادی کے تعلق، ان کی اصلاح و تربیت اور طریقِ دعوت و تبلیغ پر بڑی بصیرت افروز گفتگو کی ہے۔ بعض اُن علماء، مبلّغین اور مرشدین کا بھی تذکرہ کیا ہے، جنھوں نے اِس برادری کو اپنے انداز رشد و ہدایت سے فیض یاب کیا ہے اور ان کا بھی جو اِس برادری سے نسلی و نسبی تعلق رکھتے تھے اور اپنے اصلاحی و تربیتی مشن سے ملّت اسلامیہ کے ایک بڑے طبقے کو روشن و منور کیا۔

اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے مخدوم زادے عزیز القدر مولانا محمد قاسمی پرتاپ گڑھی نے ''پرتاپ گڑھ کی اسلامی تاریخ'' لکھ کر ایک عظیم اور روشن کارنامہ انجام دیا ہے۔ ملّت اسلامیہ خصوصاً پرتاپ گڑھ اور دوسرے مقامات پر بسنے والی قریشی ہاشمی برادری کے علما اور دانش وروں کو اُن کا ممنون و متشکر ہونا چاہیے۔ انشاء اللہ اپنے اِس کارنامے کی وجہ سے وہ تا دیر یاد کیے جاتے رہیں گے۔ میں اپنے عزیز بھائی محمد بن یار قاسمی پرتاپ گڑھی کو ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں اور ان کے روشن و تاب ناک علمی مستقبل کے لیے دعا گو ہوں۔

تابش مہدی

۲۲/ ۳/ ۲۰۲۳ء

بیت الراضیہ، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر

نئی دہلی: ۲۵۔

رابطہ: ۹۸۱۸۳۲۷۹۴۷

تائیدی کلمات

حضرت مولانا سید ازہر مدنی صاحب زید مجدہ

نبیرۂ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ وناظم جمعیۃ علمائے ہند

عزیز گرامی مولانا محمد قاسمی سلمہ کی علمی کاوش ''پرتاپ گڑھ کی اسلامی تاریخ عہد بہ عہد'' کے نام سے اس کتاب کو دیکھنے کا اتفاق ہوا، جسے پڑھ کر موصوف کے علمی ذوق کا اندازہ ہوا، اللہ تعالیٰ نے موصوف کے ذریعہ علماء پرتاپ گڑھ کے سروں پر جو قرض تھا اس کو اتروا کر موجودہ اور آنے والی نسلوں کی پیاس کو ہمیشہ کے لئے بجھا دیا، کہ اگر کوئی شخص مستقبل میں علماء پرتاپ گڑھ کے بارے میں قلم اٹھانے کی کوشش کرے گا، تو بغیر اس کتاب کے استفادے کے کچھ لکھنا مشکل ہوگا۔

ہر آدمی بخوبی جانتا ہے کہ تاریخ اور اس میں گزرے ہوئے چاند ستاروں کی زندگی کو، بکھرے ہوئے اوراق پارینہ سے نکال کر منظر عام پر یکجا کرنا بہت مشکل کام ہوتا ہے، لیکن عزیز مکرم کی رات و دن کی لگن نے اس کو آسان بنا کر اس طرح پیش کر دیا کہ گویا کہ علماء پرتاپ گڑھ کے علمی کارنامے جو آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ ہیں، ہر پڑھنے والے کے لئے آسان ہو گئے۔

میری دعا ہے کہ باری تعالیٰ! اس ہونہار مصنف کی زندگی کے ہر موڑ پر کامیابیاں و کامرانیاں قدم بوسی کرتی رہیں اور اپنی علمی کاوشوں کو ہر میدان میں اسی طرح پیش کرتے رہیں اور ہر طبقے میں داد تحسین کے پھولوں سے اپنے دامن کو بھرتے رہیں۔

تصدیق وتائید

حضرت مولانا حکیم الدین صاحب قاسمی

ناظم عمومی جمعیۃ علمائے ہند

’’پرتاپ گڑھ کی اسلامی تاریخ عہد بہ عہد‘‘ برادرگرامی قدر مولانا محمد پرتاپ گڑھی کی تالیف ہے، جس میں موصوف نے مشرقی یوپی کے مردم خیز ضلع ’’پرتاپ گڑھ‘‘ میں اسلام کی آمد، زمانۂ ماضی میں اس کی دینی وعلمی مرکزیت اور سیاسی اہمیت کوانتہائی شرح وبسط کے ساتھ، معتبر حوالوں سے بیان کیا ہے۔ جس کے ضمن میں ہندوستان کی مکمل اسلامی تاریخ (ازمحمد بن قاسم تاقیام دارالعلوم دیوبند وجمعیۃ علمائے ہند) پر بھی مختصراً روشنی ڈالی ہے۔

ساتھ ہی وہاں کے ماضی قریب کے اکابر علمائے دین و مشائخ عظام خصوصاً بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب، عالم شہیر حضرت مولانا منیراحمد صاحب یغمانی، مصلح ملت حضرت مولانا محمد یار صاحب رحمہم اللہ کے حالات زندگی اوران حضرات کی دینی، علمی و ملی خدمات کوبھی بیان کیا ہے۔ بلاشبہ کتاب اپنی جامعیت کے اعتبار سے’’دریا بکوزہ‘‘ کی مصداق ہے۔

مؤلف گرامی مولانا محمد صاحب پرتاپ گڑھی (استاذ ونگراں مدرسہ انوارالقرآن بارہ بنکی، شاخ دارالعلوم دیوبند) حضرت مولانا محمد یار صاحب قدس سرہ العزیز کے چھوٹے صاحب زادے ہیں۔ موصوف نے والدگرامی کے زیرنگرانی جس علمی وروحانی ماحول میں تربیت پائی ہے، اسی کا یہ اثر ہے، کہ اس درجہ کا تحقیقی وعلمی کام اللہ رب العزت موصوف سے لے رہا ہے۔

حضرت مولانا محمد یار صاحب رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد

مدنی قدس سرہ العزیز کے بافیض شاگرد، مسترشد خاص اور خادم تھے۔ وہ اپنے شیخ واستاذ کے عاشق زار، ان کے علوم وافکار اور خیالات ونظریات کے علماً وعملاً نمونہ تھے۔ میں چھوٹا تھا، لیکن ملاقات کا موقعہ بہت ملا، بارہا خدمت میں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی، وہ اپنے شیخ ومرشد حضرت شیخ الاسلام کا تذکرہ انتہائی محبت وعقیدت سے کرتے اور اس دوران ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے تھے۔

برادر گرامی مولانا محمد صاحب اس سے پہلے پرتاپ گڑھ کے علماء کے احوال وآثار پر مشتمل کتاب ''تذکرہ علمائے پرتاپ گڑھ'' تالیف کر کے اہل علم سے داد تحسین وصول کر چکے ہیں۔ اللہ رب العزت موصوف کی دیگر کتب کی طرح، اس کتاب کو بھی قبولیت عامہ عطا فرمائے اور ذریعہ آخرت بنائے۔ آمین

حکیم الدین قاسمی

(حضرت مولانا) حکیم الدین قاسمی (صاحب)

ناظم عمومی جمعیۃ علمائے ہند

۵؍جنوری ۲۰۲۳ء

تصویب وتوثیق

حضرت مولانا محمد اشفاق حمید صاحب پرتاپ گڑھی

استاذ دارالعلوم دیوبند

باسمہ تعالیٰ

اس وقت بندے کے سامنے ''پرتاپ گڑھ کی اسلامی تاریخ عہد بہ عہد'' نامی کتاب ہے، جو دارالعلوم دیوبند کے ایک ہونہار فاضل مولانا محمد پرتاپ گڑھی کی تالیف ہے، جو حضرت مولانا محمد یار صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فرزندار جمند ہیں۔اس حوالہ سے مؤلف موصوف اپنی ذاتی خوبیوں کے ساتھ، بڑی نسبت کے مالک ہیں، کیونکہ ان کے والد بزرگوار علمی، عملی، فکری، اصلاحی اور احسانی جیسی مختلف خوبیوں کے حامل ہونے کے ساتھ، اُنھیں یہ شرف بھی حاصل تھا کہ وہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے شاگرد رشیداور''حافظ جی'' کے نام سے مرکز توجہ بھی تھے۔

کچھ دیدہ: میرے بچپن کے سال دوسال ممبئی میں گزرے ہیں، آٹھ نو سال کی عمر تھی، اللہ کی توفیق سے بچپن سے دین اور دینداروں سے محبت اور دنیا کی لغویات سے بُعد تھا ،وہاں کی مسجد میں اکثر وقت گزرتا، مولانا رحمۃ اللہ علیہ سال میں وہاں ایک دوبار تشریف لاتے، والدؒ صاحب سے تعلق بھی تھا، میں ان کو بہت توجہ سے دیکھتا، رشک کرتا اور دل میں بار بار یہ خیال آتا کہ ایسا بننا چاہئے، اکثر قرآن پاک پڑھتے رہتے، ان کے قابل تقلید احوال آپ کتاب میں پڑھیں گے۔

کتاب کے خاصے حصے پر بندے نے نگاہ ڈالی اور استفادہ کیا، ماشاءاللہ موضوع سے متعلق بڑی عرق ریزی، جانفشانی اور محنت سے بہت سے تاریخ کے خزینے اور دفینے جمع کر کے، عمدہ لڑی میں پرودیا ہے۔ضلع پرتاپ گڑھ کی تاریخی حیثیت جو مختلف حوالوں

سے امتیازی شان اور اونچا مقام رکھتی ہے، جبکہ بہتوں کی آنکھوں سے اس کی حیثیت اوجھل ہے۔ مولانا مؤلف نے مختلف پہلوؤں سے اس کو واضح کر دیا ہے۔

مشہور مؤرخ قاضی اطہر مبارکپوریؒ کی مستند تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ پرتاپ گڑھ کا ''مانک پور'' پورب کا پہلا علمی و دینی مرکز تھا، سیاسی، دفاعی اور تجارتی اعتبار سے بھی بڑی اہمیت حاصل رہی۔ شیخ حسام الدین مانک پوریؒ سے وابستگی کو اس وقت کے اولیاء وعلماء سعادتِ عظمیٰ سمجھتے تھے۔ ''مسعود سالار غازی'' پرتاپ گڑھ کے اسلامی محسن ہیں۔

تاریخ انتہائی توجہ کا حامل فن ہے، احادیث کا ایک اہم باب ''فن اسماء الرجال'' میں اس کا بڑا دخل ہے۔ جبکہ فن تاریخ سے واقف انسان، ماضی کے احوال و کوائف، نشیب وفراز اور سوز وگداز سے خوب بہرہ ور ہوتا ہے، جس کے نتیجہ میں حال کو درست کرتا ہے اور کچھ کر گزرنے والا امت کا سپوت مستقبل کے لئے منصوبہ بندی اور لائحہ عمل تیار کر کے پُرعزم اور با حوصلہ ہوتا ہے، جبکہ تاریخ سے کورا انسان اپنے اندر حرکت کی کوئی خاص وجہ نہیں پاتا۔ چونکہ اس کتاب میں ہند کے مختلف مسلم حکمرانوں کا ذکر اور کارہائے نمایاں کا اجمالی تذکرہ ہے، اس لئے مختصراً ''تاریخ دار العلوم'' سے دو پیراگراف کا ذکر یہاں موزوں معلوم ہوتا ہے:

''یہ ایک ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ مسلم فاتحین نے اس ملک کو فتح کر کے، یہاں کے باشندوں کا نہ صرف دل جیت لیا، بلکہ وہ اسی سرزمین کے ہو کر رہ گئے، انھوں نے خود کو اس سرزمین کی خدمت کے لئے وقف کر دیا اور برصغیر کے مختلف حصوں اور اور ٹکڑوں کو ملا کر، ایک عظیم ہندوستان کا روپ دیا۔ انھوں نے ملک کے تمام باشندوں کے ساتھ یکساں عدل وانصاف، مساوات وبرابری اور اخوت وہمدردی کا معاملہ کیا، ان کی انصاف پسندانہ پالیسیوں کی بدولت ملک نے بے پناہ ترقی کی اور اقوام عالم میں اسے نمایاں مقام حاصل ہوا، ہندوستان کی خوشحالی اور ترقی کے چرچے عرب، افریقہ اور یورپ میں ہونے لگے۔

دوسری طرف یہ بھی ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے طرز وسلوک، عادات واخلاق اور خاص طور سے صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کی خاموش تبلیغ کی

بدولت عام ہندوستانیوں کی ایک بڑی تعداد نے اسلام کا دامن تھاما۔ اسلام کے ان بے لوث خادموں اور ''شاہانِ بوریہ نشیں'' کی زندگیاں ان مخلص مبلغوں کی بہترین مثال ہے، جن کے سایۂ عاطفت میں ہندوستانی معاشرے کے ستائے ہوئے ہزاروں مظلوموں کو نہ صرف پناہ ملی، بلکہ تنگ وتاریک دنیا میں روشنی وکشادگی کے لئے ترستی ہوئی انسانیت کو خدا کی وسیع زمین میں، فطرت کے انمول خزانوں سے بہرہ ور ہونے اور غلامی ومحکومی کی آہنی زنجیروں سے جکڑے ہوئے بے بس انسانوں کو خالق کائنات کی بخشی ہوئی آزادی سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ حضرت سید علی ہجویریؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ اور سید علی بن شہاب ہمدانی وغیرہ کا شمار انہی بزرگوں میں ہوتا ہے۔''

بہر حال یہ کتاب ''پرتاپ گڑھ'' کی تاریخی حیثیت کو بہت اُجاگر اور آشکارا کرتی ہے، اس کے ضمن میں اُن بہت ساری محسن شخصیات کا ذکر خیر آگیا ہے جن کی دینی علمی وملی خدمات ومجاہدات کی بناء پر یہ علاقہ بہت سی رسوم وبدعات سے پاک صاف ہے اور بہت سے قلوب میں وحدانیت اور عمل صالح کی تخم ریزی ہوئی ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ مؤلف موصوف کا تالیفی اور تاریخی ذوق انتہائی صاف ستھرا اور بڑی دلچسپی کا عکاس ہے۔ خدا مزید خدمات کی توفیق ارزاں فرمائے اور رب کریم ان تاریخی کارناموں کو سامنے رکھ کر فکرمند، باحوصلہ اور پُرعزم ہو کر کچھ کر گزرنے کا جزبہ وحوصلہ عطا فرمائے، تاکہ ''پدرم سلطان بود'' ہی نہ رہ جائے۔

والسلام

محمد اشفاق حمید پرتاپ گڑھی

(استاذ دارالعلوم دیوبند)

۲۰/۶/۱۴۴۴ھ

تقریظ

حضرت مولانا صغیر احمد صاحب پرتاپ گڑھی

استاذ حدیث جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند

صوبہ یوپی کا ضلع ''پرتاپ گڑھ'' خصوصاً اس کا قصبہ ''مانک پور'' اپنی مردم خیزی، سرسبزی وشادابی اور سیاسی وجغرافیائی حیثیت سے ملک کا ایک ایسا خطہ ہے، جس کو قدیم زمانے میں سیاسی وصنعتی اعتبار سے بھی اور دینی وملی اعتبار سے بھی مرکزیت حاصل رہی ہے، یہ وہ خطہ ہے (مرکز وسرحد سے دور ہونے کے باوجود) جہاں محمود غزنوی کے بھانجے سالار مسعود غازیؒ کے زمانے ہی میں اسلام اپنی تمام تر خوبیوں اور عظمتوں کے ساتھ آ گیا تھا، جب کہ سرحدی اور مرکزی علاقوں کے علاوہ، ہندوستان کے دور دراز کے علاقے ابھی اسلام سے واقف نہیں ہوئے تھے اور پھر اس کے بعد مسلسل اسے علماء وصلحاء، اولیاء واتقیاء کا مسکن ہونے کا شرف حاصل رہا۔

مورخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ زمانہ قدیم میں اس کی علمی و دینی مرکزیت کی بابت، صاحب مآثر الکرام کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

''دیار پورب کا پہلا علمی دور سلطان قطب الدین ایبک کی ابتدائے سلطنت: ۶۰۲ھ سے شروع ہوکر خلجی دور سے ہوتا ہوا، تغلق دور: ۷۷۲ھ میں جونپور کی تعمیر وتمصیر پر ختم ہوا۔ اس پونے دوسوسالہ دور میں پورب میں علماء وفضلاء اور مشائخ کی اچھی خاصی تعداد قصبات و دیہات میں پائی جاتی تھی، مگر ''کڑا مانک پور'' کے علاوہ پورب کے علاقہ میں کوئی دوسرا علمی اور دینی مرکز نہیں تھا، تا آں کہ تغلق خاندان کے تیسرے حکمراں سلطان فیروز شاہ تغلق نے: ۷۷۲ھ میں، شہر جونپور آباد کر کے ایک عظیم علمی و دینی مرکز قائم کیا۔'' (دیار پورب علم اور علماء)

جب کہ سیاسی ودفاعی اعتبار سے ایک زمانہ تک اس کی کیا حیثیت رہی؟ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ ملک چھجو کو (جو بلبن کا بھتیجہ تھا اور مانک پور کا گورنر تھا) جب شاہی نیابت پیش کی گئی، تو اس نے مانک پور کی گورنری کو شاہی نیابت پر ترجیح دی۔ اسی طرح قطب الدین ایبک اور علاؤالدین خلجی جیسے فرماں رواں، بادشاہ بننے سے پہلے یہیں کے گورنر تھے۔

ہنٹر کے حوالہ سے مولانا حسین مترجم سفرنامہ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ ''کڑا مانک پور ،صوبہ جات متحدہ یو پی کا دارالخلافہ تھا، الہ آباد کے قلعہ کی تعمیر سے پہلے جو اکبر بادشاہ نے بنایا تھا، علاقہ کا صوبیدار (گورنر) یہیں قیام کرتا تھا، لیکن اکبر نے صوبیدار کو الہ آباد میں رہنے کا حکم دیا۔ آصف الدولہ بہت سے پرانے مکانات کا پتھر لکھنؤ لے گیا۔ پہلے یہاں کا کاغذ مشہور تھا، اب انگریزی کارخانے جاری ہونے کے باعث اس کی قدر جاتی رہی۔ کمبل بھی اچھے تیار ہوتے تھے۔'' (ہنٹر)

ان تاریخی شواہد سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایک دور میں علمی و دینی اور سیاسی و دفاعی بلکہ صنعتی وتجارتی اعتبار سے بھی اسے اہمیت حاصل تھی اور دلی کے بعد اسے ایک بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ ضرورت تھی اوراق میں منتشر یہاں کی تاریخ کو جمع کرنے کی اور یہاں کی تابناک ماضی سے نسل نو کو آگاہ کرنے کی۔

برادر خورد عزیزم مولانا محمد محبوب الٰہی قاسمی نگراں مدرسہ انوار القران بارہ بنکی (شاخ دارالعلوم دیوبند) نے اس ضرورت کا احساس کیا اور ''پرتاپ گڑھ کی اسلامی تاریخ عہد بہ عہد'' میں یہی نہیں کہ یہاں کی اسلامی، سیاسی اور جغرافیائی تاریخ کو جمع کیا ہے، بلکہ عزیزم نے پرتاپ گڑھ کی ایک ایسی تاریخ مرتب کردی ہے جو نسل نو کے لئے ایک دستاویز اور مایۂ افتخار ہے۔ اپنے انداز، اپنی نوعیت اور اپنی ضخامت کے اعتبار سے کسی ایک ضلع کی یہ ایک ایسی تاریخ ہے کہ شاید ہی ضلعی اعتبار سے کسی اور ضلع کی ایسی جامع اور مرتب تاریخ لکھی گئی ہو۔

عزیزم کو اللہ رب العزت نے علم تفسیر و حدیث کے ساتھ تاریخ سے بھی دلچسپی عطا فرمائی ہے اور درس وتدریس کے ساتھ تقریر وتحریر کا بھی منفرد ملکہ عطا فرمایا ہے، مختلف

موضوعات پر عزیزم کی کئی کتابیں علمی حلقوں میں مقبول ہیں۔ ''تذکرہ علماء پرتاپ گڑھ'' عزیزم ہی کے قلم گہر بار سے منصۂ شہود پر آئی، جس میں پرتاپ گڑھ کے ماضی بعید سے لے کر، ماضی قریب تک کے تقریباً قابل ذکر تمام ہی علماء، صلحاء، واعظین و مبلغین کی خدمات جلیلہ کو انتہائی مفصل انداز میں قلم بند فرمایا ہے۔

بلاشبہ ان قابل فخر کارناموں کو انجام دینے پر عزیزم اہل پرتاپ گڑھ کی طرف سے قابل مبارکباد ہیں اور بجا طور پر ''فخر پرتاپ گڑھ'' کہے جانے کے مستحق ہیں۔

اللہ رب العزت عزیزم کی اس تالیف کو بھی دیگر تالیفات کی طرح قبولیت عامہ سے نوازے اور ذخیرہ آخرت بنائے۔

والسلام

انا الاحقر الافقر

ابوطہ صغیر احمد پرتاپ گڑھی/دیوبند

۱۸/جمادی الاولی ۱۴۴۴ھ

۱۳/دسمبر ۲۰۲۲ء

مقدمہ

مفسر قرآن حضرت مولانا قاضی محمد امین صاحب دامت برکاتہم

قاضئ شریعت دار القضاء اوگئی پور و مہتمم مدرسہ رشیدیہ اوگئی پور پرتاپ گڑھ

فن تاریخ علم کا ایک عظیم حصہ ہے، یہی وجہ ہے کہ کتب سماویہ میں امم ماضیہ کے احوال کو باری تعالیٰ نے مکرر، سہ کرر بیان کیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے موقع بموقع تاریخی روایات سے استشہاد فرمایا ہے۔ علم تاریخ سے اگلی نسلوں کو نقش پا ملتا ہے، احوال ماضیہ سے عبرت وموعظت حاصل کرنے کا موقع فراہم ہوتا ہے اور اپنے کو جانچنے کا معیار ملتا ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ فن تاریخ ایسی پیچ دار گھاٹیوں کے مانند ہے، جس میں راہ منزل کا ہر پہلو غیر یقینی کیفیت پیدا کرتا ہے، ایسے میں راہ تلاش کر لینا آسان نہیں، بڑی جانفشانی کے بعد ہی منزل تک پہنچنا ممکن ہوتا ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد ورفت کا سلسلہ تو حضرات خلفاء راشدین کے عہد میں ہی شروع ہو گیا تھا اور دوسری صدی ہجری میں تو بعض علاقوں پر باقاعدہ اسلامی حکومت قائم ہونے کا پتہ ملتا ہے۔ نامور مورخ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری ''عہد فاروقی: ۲۳ھ میں مکران کی تاریخ'' کے زیر عنوان، تاریخ ابن خلدون اور فتوح البلدان کے حوالہ سے بایں الفاظ رقمطراز ہیں:

''علاقہ کوکن کے شہر تھانہ اور علاقہ گجرات کے شہر بھروچ میں پہلی مرتبہ مسلمان رضاکاروں نے مجاہدانہ قدم رکھا، نیز اسی دور میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ایک بھائی کو دیبل (سندھ) کی مہم پر روانہ کیا، جو وہاں سے منصور ومظفر لوٹے، چونکہ سندھ میں مجاہدین اسلام کامیاب رہے اور ہندوستان میں تھانہ اور بھروچ کی مہم غیر اطمینان بخش رہی، اس لئے سندھ میں حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے دور میں کسی نہ کسی رنگ میں اسلامی مہمات کا سلسلہ جاری رہا۔ (ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں: ص۲۶)

اس واقعہ کے سو سال بعد، پھر مملکت بلہرا کے علاقہ گجرات میں مسلمانوں کی سرگرمی

شروع ہوگئی، اس درمیان میں تمام سندھ مسلمانوں کے قبضہ میں آچکا تھا اور اموی خلفاء کے عمال وحکام یہاں حکومت کرتے تھے۔ ہشام بن عبدالملک: ۱۰۵ھ، تا: ۱۲۵ھ نے اپنے زمانے میں جنید بن عبدالرحمن مری کو سندھ کا گورنر مقرر کیا، جس نے یہاں کے حالات درست کرنے کے بعد، گجرات کے کئی شہروں پر فوج کشی کرائی اور سرحد، مندل، علاقہ جھالا واڑ کلاں، دھنج، بھروچ، بھیلمان کو فتح کیا۔ (ص:۲۸)

اس اقتباس سے واضح ہے کہ دوسری صدی ہجری میں ہندوستان کے اندر عرب اسلامی حکمرانوں کا عمل دخل جاری ہو چکا تھا، یہاں کی بعض ریاستیں صرف یہی نہیں کہ مسلمان ہوئیں، بلکہ باقاعدہ اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا اور ہندوستان میں اسلام پھلنے پھولنے لگا تھا، ظاہر ہے کہ یہ سب عرب مجاہدین کی برکات تھیں۔

یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ضلع پرتاپ گڑھ میں آباد قریشی برادری جنہیں یہاں کی خلقت نے قریش عرب کی طرف ہر زمانہ میں منسوب کیا ہے، جن کا مرکزی مستقر، بقول حضرت مصلح ملتؒ: ''جانب جنوب میں سراؤں الہ آباد اور اسی سمت میں واقع مانک پور، جانب شمال میں سلطانپور، جانب مشرق میں بادشاہ پور اور جانب مغرب میں کیتھولا رانی گنج ہے''۔ ان حدود اربعہ کے درمیان آباد قریشی برادری اپنی بہادری، فیاضی، مہمان نوازی، دوست داری، وفاداری، توحید پرستی اور شرک بیزاری وغیرہ صفات میں ضرب المثل ہے، جو قریش عرب کی مثالی صفات ہیں اور اسی برادری کو یہاں کی عوام لفظ ''مسلمان'' سے یاد کرتی ہے، جو جفاکش، محنتی اور اپنی کمائی پر انحصار کے عادی ہیں۔

اب اس وسیع وعریض ملک میں جس کے اندر قریش کی آمد کا ابتدائی مرکز سندھ، گجرات ومہاراشٹر تھا۔ یہ ''قریش'' ہندوستان کے شمالی حصہ الہ آباد سے متصل ''بیلہا'' (پرتاپ گڑھ) میں کب آئے، اس کے اسباب وعوامل کیا تھے؟ یہ ایک طویل سفر کی دراز داستان ہے، جو تاریخ کے ہزاروں صفحات میں پھیلی ہوئی ہے، تاریخ کے سمندر میں غوطہ لگا کر گوہر تابدار نکال لانا، سب کے بس کی بات نہ تھی۔ یہ حوصلہ خلاق عالم کی جانب سے چھوٹے بھائی عزیزم مولانا محبوب الٰہی محمد سلمہ (نگراں مدرسہ انوار القرآن بارہ بنکی، شاخ دارالعلوم دیوبند) کے

لئے مقدر تھا، جو پرتاپ گڑھ کے ایک قریشی خانوادۂ علمی کے چشم و چراغ، پرتاپ گڑھ کی مایۂ نازہستی مصلح ملت شیخ المشائخ حضرت مولانا محمد یار صاحب قدس سرہ کے ساتویں عالم و فاضل فرزند ارجمند ہیں، موصوف نے تاریخ کی سینکڑوں کتابوں کی ورق گردانی کی، عربی و فارسی تاریخوں کا بھی مطالعہ کیا اور انگریزی گزیٹر کا بھی معائنہ کیا، نہایت عرق ریزی کے ساتھ حوالوں سے مرصع کر کے، اہل قریش کی ایک مستند تاریخ مرتب کر دی ہے، ساتھ ہی عہد ماضی میں یہاں کی دینی واصلاحی سرگرمیوں کا تذکرہ بھی شرح و بسط کے ساتھ کیا ہے۔

فی الحال مسودہ کتابی شکل میں میرے سامنے نہیں ہے، بلکہ کمپیوٹر پر ہے، اسلئے اس کا مطالعہ تو میرے لئے مشکل تھا، تاہم کتاب متفرق مقامات سے مجھے سنائی گئی، جس سے متاثر ہو کر یہ چند سطریں لکھنے کا داعیہ پیدا ہوا۔

کتاب جن مضامین پر مشتمل ہے، وہ مختصراً فاضل مصنف کی کتاب ''تذکرہ علمائے پرتاپ گڑھ'' میں آچکے ہیں، جو چند سال پہلے طبع ہو کر شرف قبولیت حاصل کر چکی ہے، اب اس کتاب میں ان مضامین کو مفصل و مدلل طریقہ پر لایا گیا ہے، جس میں پرتاپ گڑھ میں اہل قریش کی آمد کی تحقیق و تاریخ کے ساتھ پرتاپ گڑھ میں قرون گذشتہ کی مومنانہ، مجاہدانہ و مصلحانہ سرگرمیوں کو موضوع بنا کر تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے۔ حق تعالیٰ شانہ انکے حوصلہ کو مزید بلندی عطا کرے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

عزیزم کی علمی و تاریخی بصیرت سے اور بھی توقعات وابستہ ہیں، اللہ تعالی موصوف کی محنت کا صلہ اور کتاب کی طباعت کے مراحل آسان فرمائے، تاکہ کتاب طبع ہو کر خزانۂ علمی میں ایک مفید اضافہ ثابت ہو، کتاب قابل استفادہ ہے۔ حق تعالیٰ شانہ اسے قبولیت عامہ نصیب فرمائے۔ آمین

فقط: محمد امین غفرلہٗ

خادم دار القضاء اوگئی پور

۶/ جمادی الاولی ۱۴۴۴ھ، ۱/ دسمبر ۲۰۲۲ء

عرضِ مؤلف

بسم الله الرحمن الرحیم

الحمدللہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی نبیہ
محمد و علی آلہ و اصحابہ اجمعین۔ اما بعد

تاریخ کی حیثیت قوم وملت کے لئے وہی ہے، جو فرد کے لئے ذہنی یادداشت کی ہے کہ ذہن سے اگر یادداشت کی قوت جاتی رہے، تو انسان کسی قابل نہیں رہتا۔ ایسے ہی قوم وملت اگر اپنی تاریخ سے نابلد ہو تو اس سے کسی کارنامہ کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ شاعر مشرق علامہ اقبال نے اسی فلسفہ کو سمجھایا ہے:

قوم روشن از سواد سر گذشت
خود شناس آمد ز یاد سر گذشت

(قوم اپنی تاریخ سے روشن ہوتی ہے اور اپنی تاریخ کی یاد سے اسے اپنی پہچان آتی ہے)

سرگذشت او گر از یادش رود
باز اندر نیستی گم می شود

(اس کی تاریخ اگر اس کی یاد سے محو ہو جائے۔ تو پھر وہ فنا میں گم ہو جاتی ہے۔)

ضبط کن تاریخ را پایندہ شو
از نفسہائے رمیدہ زندہ شو

(تاریخ کو محفوظ کر (اور) پائندہ ہو جا۔ اور گذری ہوئی سانسوں سے زندہ ہو جا۔)

چشم پر کارے کہ بیند رفتہ را
پیش تو باز آفریند رفتہ را

(ایک ہوشیار آنکھ جو ماضی پر نظر رکھتی ہے۔تمہارے سامنے اسے دوبارہ زندہ کرسکتی ہے)

صید گیرے کو بدام اندر کشید
طائرے کز بوستان ما پرید

(یہ وہ شکاری ہے، جو جال کے اندر ایسے پرندے کو کھینچ لاتا ہے، جو ہمارے باغ سے اڑ چکا ہے۔)

اس کتاب کی تالیف کا مقصد بھی یہی ہے کہ قوم کے لوگ اپنے کو پہچانیں اور اپنے تابناک ماضی کی روشنی میں روشن مستقبل کی فکر کریں۔

تالیف کا باعث یہ ہوا کہ دارالعلوم دیوبند میں تحصیل علم کے زمانہ میں بندہ نے ایک کتاب بعنوان ''تذکرہ علمائے پرتاپ گڑھ'' مرتب کی تھی۔ جس میں ضلع پرتاب گڑھ کے ماضی قریب وبعید کے قابل ذکر تقریباً تمام ہی علماء ومشائخ کا تفصیلی تذکرہ آیا۔ کتاب کے مقدمہ میں بندہ نے پرتاپ گڑھ کی اسلامی تاریخ کے حوالہ سے بھی کچھ باتیں تحریر کردی تھیں۔ جسے باذوق حضرات نے پسند کی نگاہ سے دیکھا۔لیکن چوں کہ وہاں یہ بحث ضمناً آئی تھی، اس لئے اس میں نقص ہونا ناگزیر تھا۔

بعد کو ارادہ ہوا کہ اگر بالتفصیل معتبر کتب کے حوالوں سے ''پرتاپ گڑھ کی اسلامی تاریخ'' مرتب کردی جائے تو نہ صرف یہ کہ وہ نقص دور ہوجائے گا، بلکہ ایک تاریخی کتاب بھی مرتب ہوجائے گی۔ چنانچہ بعون اللہ وکرمہ اس ارادہ سے کام کو شروع کیا۔

تاہم عام آدمی کے لئے کسی علاقہ وضلع کی تاریخ کا سمجھنا، ملک کی عمومی تاریخ کے بغیر دشوار ہے۔اس لئے بندہ نے کتاب میں طریقہ یہ اپنایا ہے کہ اولاً عہد بعہد ملت اسلامیہ ہند کی عمومی تاریخ کا اجمالا ذکر ہے، پھر اس کی روشنی میں پرتاپ گڑھ کی اسلامی تاریخ لکھی گئی ہے۔خاص کر ہندو پاک میں عربوں کی اسلامی حکومت اور مختلف ادوار میں قائم ریاستی اور علاقائی حکومتوں کا ذکر اہمیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔تاکہ مطالعہ کرنے والے حضرات

بصیرت کے ساتھ حقیقت سے آگاہ ہوں۔ بندہ اپنے مقصد میں کتنا کامیاب ہے،اس کا فیصلہ قارئین کرام کریں گے۔فروگزاشت پرعفوودرگزر کی درخواست ہے۔

خوشی کے اس مبارک موقع پر اپنے مشفقوں،کرم فرماؤں اور محسنوں کا تذکرہ نہ کرنا، بڑی ناسپاسی ہوگی۔خصوصا حضرت الاستاذ مولانا عبدالخالق صاحب مدراسی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند،جن کی مربیانہ عنایتوں نے بندہ کواپنا اسیر بنالیاہے۔

نسيت كل طريق كنت اعرفه
الاطريقايودينى الى ربعكم

اسی طرح نبیرہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید ازہر مدنی صاحب جنھوں نے زمانہ طالب علمی سے لیکراب تک، زندگی کے ہرموڑ پر اپنی شفقتوں سے گرانبار کیاہے۔مشفق و کرم فرما محترم جناب ڈاکٹر تابش مہدی صاحب،حضرت مولانا حکیم الدین صاحب ناظم عمومی جمعیۃ علمائے ہند،حضرت مولانا اشفاق احمد صاحب پرتاپ گڑھی استاذ دارالعلوم دیوبند وغیرہ کے شکرگزار ہیں کہ ان حضرات نے اپنی گرانقدر تائیدات وتصدیقات سے کتاب کے اعتبار میں اضافہ کیاہے۔

برادر اکبر حضرت الاستاذ مولانا قاضی محمد امین صاحب مہتمم مدرسہ رشیدیہ اوگئی پور پرتاپ گڑھ اورحضرت مولانا محمد صغیر صاحب استاذ حدیث جامعہ امام محمد انور دیوبند کسی شکریے سے بالاتر ہیں کہ اول الذکر کی زیر سرپرستی بندہ کی پرورش وتربیت ہوئی اور ثانی الذکر نے کتاب کی تالیف میں از اول تا آخر ہرطرح سے تعاون کیاہے۔ بھائی عین الحسن پرتاپ گڑھی مقیم سنجے نگر کرلا ممبئ بھی شکریے کے مستحق ہیں کہ ان کے ہی تعاون سے کمپوزنگ وغیرہ کا مرحلہ آسان ہوا۔باری تعالی سب کو اپنی شایان شان بدلہ عنایت فرمائے۔وصلی اللہ وسلم علی سیدنا محمدو الہ وصحبہ اجمعین

محبوب الٰہی محمد قاسمی پرتاپ گڑھی

خادم الطلبہ مدرسہ انوارالقرآن (شاخ دارالعلوم دیوبند) سترکھ بارہ بنکی

۱۱؍رجب المرجب ۱۴۴۴ھ،مطابق ۳؍فروری ۲۰۲۳ء

کلماتِ تشکر

یگانگت ومجانست اورمحبت وشفقت کا جو سلسلہ والد محترم حضرت مولانا محمد یار صاحب اور حضرت مولانا عبدالقدوس صاحب نور اللہ مرقدہم سے شروع ہوا تھا اور جس کی آبیاری محترم جناب حکیم حافظ شبیر احمد صاحب اور محترم جناب حکیم مولانا ضمیر احمد صاحب رحمہم اللہ تعالیٰ ہمیشہ کرتے رہے اور بڑے بھائیوں کی طرح دینی وعلمی کاموں میں تعاون کے ساتھ اپنی شفقتوں وعنایتوں سے بھی ہمیشہ نوازتے رہے۔ برد اللہ مضجعہ.

اسی خانوادۂ قدوسی کے میر کارواں حافظ ابوعبیدہ صاحب مالک مدینہ نرسنگ ہوم حبیب نگر قصبہ ڈروا پرتاپ گڑھ کی عنایتوں اور دست تعاون سے کتاب کی طباعت کا مشکل ترین مرحلہ طے ہوا۔

راہِ وفات پہ اہل وفا کیوں نہ مر مٹیں
اس میں بھی زلف یار کا کچھ پیچ وخم تو ہے

رب کریم موصوف کو اوران کے برادران کو دنیا وآخرت میں بہترین صلہ عنایت فرمائے اوران کے بزرگوں کو جنّت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔آمین

محمد پرتاپ گڑھی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ الذی خلق الانسان من ذکر وانثی وجعلھم شعوبا وقبائل، ثم جعل التقوی بینھم مبنی الکرامۃ والشرف، والصلوۃ والسلام علی النبی الذی ارسل الی الناس کافۃ بشیرا ونذیرا وعلی آلہ واصحابہ اجمعین ومن تبعھم باحسان الی یوم الدین، امابعد

پرتاپ گڑھ

پرتاپ گڑھ، اودھ (صوبہ یوپی، ہندوستان) کا ایک قدیم اور تاریخی مردم خیز علاقہ ہے۔ اس کے شمال مشرق میں سلطان پور، جنوب میں الہ آباد، شمال مغرب میں رائے بریلی، جنوب مغرب میں فتح پور اور جنوب مشرق میں جونپور واقع ہے۔ یہاں سے بجانب شمال مغرب ۱۶۶/کلومیٹر کے فاصلہ پر صوبہ یوپی کا مرکزی شہر لکھنؤ واقع ہے۔ جب کہ ملک کی راجدھانی دلی سے اس کا فاصلہ تقریباً: ۷۰۰/کلومیٹر کا ہے۔

طول البلد مشرق ومغرب میں: ۸۱/درجہ ۱۹/دقیقہ اور ۸۲/درجہ، ۲۷/دقیقہ ہے۔ جب کہ عرض البلد: شمال وجنوب میں ۲۵/درجہ، ۳۴/دقیقہ اور ۲۶/درجہ، ۱۱/دقیقہ ہے۔ کل رقبہ: ۳,۷۱۷/اسکوئر کلو میٹر ہے اور: ۱,۴۳۵/ربع میل۔ سطح سمندر سے اونچائی: ۳۰۰/فٹ ہے۔

کل آبادی: ۲۰۱۱ء کے اعداد وشمار کے مطابق: ۳,۲۰۹,۱۴۱ ہے۔ مسلمانوں کی تعداد: ۴۵۲,۳۹۴/ہے، جو یہاں کی کل آبادی کا: ۱۴.۱۰%/، فیصد ہے۔ شرح تعلیم: ۷۳.۱/فیصدی ہے۔

زمین کا اکثر حصہ زرعی اور کھیتی باڑی والا ہے۔ پہاڑ یہاں کوئی نہیں ہے، البتہ ندیاں اور نہریں کئی ایک ہیں، ان میں سب سے مشہور ندی ''سئی'' ہے۔ اصل پیداوار گیہوں،

چاول، باجرہ، ارہر، مٹر اور چنا ہے۔ پھلوں میں آم، کٹھل، مہوا اچھے ہوتے ہیں۔ یہاں کی سب سے مشہور پیداوار ''آملہ'' ہے، جس کی برآمدگی بڑے پیمانہ پر ہوتی ہے۔

ضلع پرتاپ گڑھ، پرگنہ مانک پور، پرگنہ پٹی اور پرگنہ پرتاپ گڈھ سے مل کر بنا ہے۔ یہ تینوں الگ الگ پرگنے تھے، ۱۸۵۸ء کی ضلعی حد بندی میں پرگنہ پرتاب گڑھ کو، مانک پور اور پٹی سے ملا کر ایک ضلع قرار دیدیا گیا۔ ابتداء میں سلون اور پرشدے پور بھی اسی کا حصہ تھے، لیکن بعد میں ''سلون'' اور ''پرشدے پور'' کو ضلع رائے بریلی میں شامل کردیا گیا۔ پرگنہ پرتاپ گڑھ کا قدیم نام ''ارر'' (Aror) (یا ''ارول'' (Arol) تھا۔

گزیٹیر: ۱۹۰۸ء میں لکھا ہے: ۱۶۲۸ء میں، ایک سوم بنشی راجپوت ''راجہ پرتاپ سنگھ'' نے اپنے والد راجہ تیج سنگھ کے انتقال کے بعد، اپنی ریاست کے پایۂ تخت کو ''تیج گڑھ'' سے رامپور (سٹی پرتاپ گڑھ) منتقل کیا، وہاں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا، اور پرانے نام ''ارر'' کو ختم کرکے پرگنہ کا نام (اپنے نام سے موسوم) پرتاپ گڑھ کرلیا۔ (گزیٹیر آف انڈیا: ۱۹۰۸ء، یوپی، ڈسٹرک پرتاپ گڑھ، صفحہ: ۳۵؍)

مانک پور (پرتاپ گڑھ) کی علمی و دینی مرکزیت:

مؤرخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ صاحب مآثر الکرام کے حوالہ سے لکھتے ہیں: ''دیار پورب کا پہلا علمی دور سلطان قطب الدین ایبک کی ابتدائے سلطنت ۶۰۲ھ سے شروع ہوکر خلجی دور سے ہوتا ہوا، تغلق دور ۷۷۲ھ میں جون پور کی تعمیر وتمصیر پر ختم ہوا۔ اس پونے دوسوسالہ دور میں پورب میں علماء وفضلاء اور مشائخ کی اچھی خاصی تعداد قصبات ودیہات میں پائی جاتی تھی، مگر ''کڑا، مانک پور'' کے علاوہ پورب کے علاقہ میں کوئی دوسرا علمی اور دینی مرکز نہیں تھا، تاآنکہ تغلق خاندان کے تیسرے حکمراں سلطان فیروز شاہ تغلق نے ۷۷۲ھ میں شہر جونپور آباد کرکے ایک عظیم علمی ودینی مرکز قائم کیا۔'' (دیار پورب علم اور علماء)

ہنٹر کے حوالے سے مولانا محمد حسین مترجم سفر نامہ ابن بطوطہ نے لکھا ہے:

''کڑا مانک پور صوبہ جات متحدہ یوپی کا دارالخلافہ تھا، الٰہ آباد کے قلعہ کی تعمیر سے پہلے

جو اکبر بادشاہ نے بنایا تھا؛ علاقہ کا صوبیدار (گورنر) یہیں قیام کیا کرتا تھا۔لیکن اکبر نے صوبہ دار کو الٰہ آباد میں رہنے کا حکم دیا۔ (اب یہ مقام الٰہ آباد کے بجائے لکھنو کو حاصل ہے) آصف الدولہ بہت سے پرانے مکانات کا پتھر لکھنو لے گیا۔ پہلے یہاں کا کاغذ مشہور تھا۔اب انگریزی کارخانے جاری ہونے کے باعث اس کی قدر جاتی رہی۔کمبل بھی اچھے تیار ہوتے ہیں۔'' (ہنٹر)

قدیم زمانے سے اس علاقہ کی زرخیزی اور یہاں کی صنعت وحرفت مشہور ومعروف رہی ہے۔چنانچہ ابن بطوطہ نے لکھا ہے:

(كرامانكبور) من أخصب بلاد الهند، كثيرة القمح والأرُز، و السكر۔ وتصنع بها الثياب الرفيعه، ومنها تجلب الى دهلي۔ وبينهما مسيرة ثمانية عشر يوما۔ (رحلة ابن بطوطه: ۲/۰۴۴/)

(کڑا مانک پور) یہ علاقہ ہندوستان میں نہایت سرسبز اور زرخیز سمجھا جاتا ہے، گیہوں، چاول اور شکر بکثرت ہوتے ہیں، کپڑا بھی بہت پیش قیمت تیار ہوتا ہے، اور دہلی فروخت کے لئے آتا ہے، یہ شہر دہلی سے اٹھارہ منزل پر ہے۔)

ہند میں اسلام کی آمد اور عربی حکومت کا قیام

آب کوثر کے مصنف شیخ اکرام لکھتے ہیں: ہندوعرب کے تعلقات بہت پرانے ہیں، اور دونوں علاقوں بالخصوص سندھ اور جنوبی عرب کے سواحل اس قدر قریب ہیں کہ ان کے درمیان تجارتی تعلقات اور دوسرے روابط قائم ہوجانا، ناگزیر تھا۔جب عرب نور اسلام کی روشنی سے منور ہوا تو عرب اور ہند کے یہ دیرینہ تعلقات منقطع نہیں ہوگئے۔ مسلمان ملاحوں اور تاجروں نے اپنے پیشرؤوں کا کام برقرار رکھا، اور اپنی کشتیاں اور جہاز لے کر عرب سے ہندوستان اور لنکا کے سواحل پر آتے جاتے رہے۔لیکن جلد ہی اِن کاروباری تعلقات کے ساتھ ساتھ سیاسی روابط بھی شروع ہوگئے، جو شروع میں اس قدر خوشگوار نہ تھے۔

اسلامی عرب اور خطہ ہند و پاک کا پہلا واسطہ جس کا تواریخ میں ذکر ہے، آغاز اسلام کے تھوڑے ہی عرصہ بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ظہور پذیر ہوا۔ اور یہ واسطہ مخالفانہ تھا۔ مشہور مورخ طبری نے لکھا ہے کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حکم بن عمر تغلبی اسلامی فوج لے کر مکران جارہے تھے کہ راستے میں ایرانی فوج نے اس کا مقابلہ کیا۔ ایرانیوں نے اپنی مدد کے لئے سندھ کے راجہ سے فوج منگائی تھی، جو عربوں کے خلاف صف آرا ہوئی۔ لیکن ایران اور سندھ کی متحدہ فوجوں کو شکست ہوئی اور جو مال غنیمت عربوں کے ہاتھ آیا، اس میں ہندوستان کے ہاتھی بھی تھے۔

قاضی اطہر مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں: ''امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ کی طرف سے جب عثمان بن ابی العاص بحرین وعمان کے گورنر بنے تو وہ اپنے بھائی حکم کو بحرین بھیج کر خود عمان پہونچے، وہاں سے تھانہ (بمبئی) کے لئے لشکر روانہ کیا، جب لشکر سالماً وغانماً واپس آ گیا تو انھوں نے امیر المومنین کی خدمت میں ایک اطلاعی خط لکھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے اس کا جو تاریخی جواب آیا، اس میں لکھا: اے ثقفی بھائی! ''حملت دوداً علی عود'' (تو نے کیڑے کو لکڑی کی سواری دی) اللہ کی قسم! اگر وہ ہلاک ہو جاتے تو میں تیری قوم سے ان کی تعداد وصول کرتا۔ (رجال السند والہند)

اصل میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بحری مہموں کے خلاف تھے، چنانچہ حضرت نے ایسی مہموں کی ممانعت کر دی۔ اس کے بعد بھی متعدد عرب افسروں کے بھروچ اور سندھ میں مختلف مقاصد سے آنے کا ذکر ملتا ہے، لیکن حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما ہندوستان پر فوج کشی کے مخالف تھے۔ اور اگرچہ سندھ کی سرحد پر مکران کے مسلمان اور سندھ کے راجہ میں گاہے بگاہے چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی، لیکن عربوں نے خلیفہ عبدالملک کے زمانے تک ہندوستان پر باقاعدہ چڑھائی نہیں کی۔ اور اس وقت بھی واقعات نے انہیں مجبور کیا۔

اس زمانے میں عراق کا گورنر حجاج بن یوسف تھا، جو عرب کی تاریخ میں اپنی بہادری، انتظامی قابلیت اور ظلم وستم کے لئے مشہور ہے۔ سندھ میں راجہ داہر حکمران تھا۔ داہر نے اس سے پہلے ہی ان عربوں کو پناہ دے کر جنھوں نے مکران کے گورنر سعید بن اسلم

کو قتل کیا تھا‘ عرب حکومت سے مخالفت کی بنیاد رکھ دی تھی، لیکن خلیفہ وقت ہندوستان پر لشکر کشی کے خلاف تھا، اوراس نے راجا کے ساتھ لڑائی ضروری نہ سمجھی۔

اس واقعہ کے چند سال بعد لنکا سے کچھ جہاز ان تحائف سے لدے ہوئے عرب آرہے تھے؛ جو لنکا کے راجہ نے حجاج کو بھیجے تھے۔ان کے ساتھ کئی مسلمان تھے؛ جو حج کو جارہے تھے۔اوران مسلمانوں کی بیویاں اور بچے بھی تھے، جو لنکا میں وفات پا گئے تھے۔بادمخالف ان جہازوں کو ساحل دیبل پر لے گئی جو(موجودہ کراچی سے تھوڑی دور ہے، اور) مملکت سندھ کی بڑی بندرگاہ تھی، یہاں دیبل کے ’’مید‘‘ لوگوں نے ان جہازوں کا مال واسباب لوٹ لیا اورعورتوں اور مردوں کو گرفتار کرکے اندرونی علاقے میں لے گئے۔حجاج کو یہ خبر ملی تو اسے بڑا طیش آیا، اس نے راجہ داہر کے پاس ایک سفیر بھیجا؛ تاکہ وہ گرفتارشدہ مردوں اورعورتوں کو رہا کرائے، اور تحفے دارالخلافہ پہنچائے۔راجہ داہر نے سفیر کو جواب دیا کہ یہ سب کام بحری ڈاکوؤں کا ہے اور میرا ان پر کوئی زور نہیں۔حجاج اس جواب سے مطمئن نہ ہوا۔(’’چچ نامہ‘‘ میں لکھا ہے کہ فتح دیبل کے بعد راجہ داہر کا وزیر’’سسکار‘‘ قیدی عورتیں محمد بن قاسم کے پاس لایا، سارے مرد اورعورتیں یہیں سے ملے۔)

حجاج نے راجا داہر کو قراروقعی سبق سکھانے کے لئے ہندوستان پر حملے کا فیصلہ کیا۔پہلے عبداللہ اور بدیل کے زیرقیادت مکران سے لشکر بھیجے گئے، لیکن راجہ داہر کے بیٹے جے سنگھ نے انہیں شکست دی اوردونوں سپہ سالار لڑائی میں شہید ہوئے۔حجاج کو ان شکستوں کا بڑا رنج ہوا، بالخصوص بدیل کی موت نے اسے بہت متاثر کیا۔چنانچہ اس نے خلیفہ وقت ولید بن عبدالملک سے منت سماجت کرکے ہندوستان میں پورے انتظام (حتی کہ سوئی دھاگہ اورسرکہ وغیرہ) کے ساتھ ایک خاص انتقامی لشکر بھیجنے کی اجازت لی اوراس کی قیادت کے لئے اپنے داماد اور چچازاد بھائی عمادالدین محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کو چنا۔(آپ کوثر)

محمد بن قاسم

محمد بن قاسم چھ ہزار سوار لے کر خشکی کے راستے ۷۱۱ء کے موسم خزاں میں دیبل پہونچا اورشہر کا محاصرہ شروع کیا، کئی روز تک کامیابی نہ ہوئی، لیکن بالآخر العروس نامی ایک

بڑی منجنیق کی مدد سے؛ جسے پانچ سو آدمی چلاتے تھے‘شہر فتح کرلیا،اور محمد بن قاسم نے قلعے پر قبضہ کر کے ان قیدیوں کو رہا کیا، جو لنکا کے جہازوں سے گرفتار ہوئے تھے۔ دیبل سے محمد بن قاسم (حیدآباد سندھ کے قریب) بیرون گیا؛ جہاں کے حاکم نے بغیر لڑائی کے ہتھیار ڈال دئے۔ پھر سہوان کی باری آئی، یہاں کا حاکم راجا داہر کا بھتیجہ تھا،شہر کے لوگوں نے اس کے خلاف بغاوت کر کے عربوں کی اطاعت کرلی۔اس کے بعد محمد بن قاسم نے’’بہمن آباد‘‘ کا رخ کیا،راوا، اور بہمن آباد کے مقامات پر راجا داہر اوراس کے بیٹے جے سنگھ کو شکست فاش دی۔ جوان ہمت سپہ سالار پھر ملتان کی طرف بڑھا اور ۷۱۳ء میں یہ تاریخی مقام بھی فتح ہوگیا،اس طرح دوسال کے عرصے میں سندھ اور ملتان کا سارا علاقہ عربوں کے ہاتھ آ گیا۔

چچ نامہ کے بیان کے مطابق محمد بن قاسم کی فوجیں شمال میں پنجاب کے اس مقام تک پہنچیں؛ جہاں دریائے جہلم میدانی علاقہ میں داخل ہوتا ہے اور جہاں کشمیر اور راجا داہر کے مقبوضات کی حدیں ملتی ہیں۔محمد بن قاسم کا ارادہ مشرقی سمت بڑھنے کا تھا، چنانچہ اس نے قنوج کے راجہ کو جس کی حکومت مغرب میں اجمیر (اور غالبا وسطی پنجاب) تک پھیلی ہوئی تھی، پیغام جنگ بھیجا،لیکن منصوبے پورے نہ ہوئے۔ ۷۱۴ء کے وسط میں اس کے خسر اور سرپرست حجاج کی وفات ہوگئی،جس کی وجہ سے محمد بن قاسم کو متامل ہونا پڑا۔اگلے سال کے شروع میں خلیفہ وقت ولید بن عبد الملک چل بسا۔ اور اس کے بعد تو دمشق میں ایک طرح کا انقلاب ہوگیا۔ولید کا جانشین اس کا بھائی سلیمان بن عبدالملک ہوا، جسے حجاج سے پرانی عداوت تھی،اس نے حجاج کے تمام اقارب اور دوستوں کے خلاف دست تعدی دراز کیا،محمد بن قاسم کو سندھ سے واپس بلا بھیجا،اوراسے اوراس کے عزیزوں کو سخت ایذائیں دے کر قتل کرادیا۔(آب کوثر)

محمد بن قاسم کے جانشین

محمد بن قاسم کی کامیابی ایک حدتک سازگار اتفاقات اور زیادہ تر اس کی اپنی شخصیت کی مرہون منت تھی۔جب وہ چل بسا تو سندھیوں نے سر اٹھایا،اس پر مشہور اموی خلیفہ

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے ایما پر سندھ کے عرب گورنر نے اعلان کیا کہ اگر سندھ کے لوگ مسلمان ہو جائیں تو انہیں عرب حکمرانوں کے مساوی حقوق ملیں گے، چنانچہ بعض سندھی قبائل اور ان کے سرگروہ' جن میں داہر کا بیٹا جے سنگھ شامل تھا' مسلمان ہو گیا۔ اس کے بعد جلد ہی خلیفۃ المسلمین حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا ۷۲۹ء میں انتقال ہو گیا۔ اور جب اس کے چار سال بعد ہشام بن عبدالملک نے ایک شخص جنید کو سندھ کا گورنر مقرر کیا تو سندھیوں نے جو خود مختار ہونا چاہتے تھے' اس کی سخت مخالفت کی، وہ کھلم کھلا بغاوت پر اتر آئے، اور جے سنگھ کی سرکردگی میں بہت سے قبیلے جو مسلمان ہو گئے تھے؛ دوبارہ ہندو ہو گئے (مولانا عبدالحلیم شرر کا خیال ہے کہ جے سنگھ صرف دکھاوے کے لئے مسلمان ہوا تھا اور وہ دل سے مسلمان نہیں تھا، جب کہ مولوی ابوظفر ندوی کی رائے ہے کہ جے سنگھ کبھی مرتد نہیں ہوا، فقط سیاسی طور پر اس نے عرب گورنر کی مخالفت کی۔)

جنید نے بغاوت کو دبا دیا، اور سندھ سے باہر مارواڑ، گجرات، اور وسطی ہند میں بھی لشکر کشی کی۔ قاضی اطہر صاحب فتوح البلدان کے حوالہ سے لکھتے ہیں: جنید ہشام کے حکم سے ''کیرج'' پر فوج کشی کی، اور اپنے عاملوں کو مربد دھنج اور بھروچ کی طرف روانہ کیا، ایک لشکر اجین بھی گیا (رجال السند والہند) مارواڑ کو اس نے فتح کر لیا، لیکن گجرات اور اجین کے راجاؤں نے اسے شکستیں دیں۔ اور بالآخر ۷۴۰ء میں وہ واپس بلا لیا گیا۔ اس کی واپسی پر حالات بگڑ گئے، حتی کہ مارواڑ، گجرات اور ''کچھ'' کی سرحدوں پر جو عرب دستے مقیم تھے؛ انہیں سندھ میں واپس بلانا پڑا۔ یہاں بھی بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ جو سندھی مسلمان ہوئے تھے، وہ سب سوائے ایک شہر کے اسلام سے منحرف ہو گئے اور عربوں کا اقتدار ختم کرنے کے لئے جو تحریکیں شروع ہوئی تھیں؛ ان کے ساتھ مل گئے۔ حالات اس قدر بگڑے کہ عرب مسلمانوں کو اپنی بیشتر چھاؤنیاں خالی کرنی پڑیں۔

جنید کی جگہ جو گورنر مقرر ہوا تھا، وہ ایک سال کے اندر مر گیا، اور نئی صورت حال کا تدارک اس کے جانشین حکم بن عوانہ کلبی کو کرنا پڑا۔ اس نے بڑی ہوش، سمجھ اور قابلیت سے کام لیا۔ سب سے پہلا کام ان منتشر عرب فوجوں کا بچانا تھا، جو ایک مخالف آبادی کے

درمیان گھرگئی تھیں۔ چنانچہ حکم نے دریائے سندھ کے دہانے کے مشرق کی طرف (حیدرآباد سندھ کے قریب) ایک مستحکم مقام چنا، اور تمام عرب فوجوں کو اس کے اندر جمع کیا، اس کا نام رکھا گیا 'محفوظہ' (یعنی جائے حفاظت)۔ جب یہ مرحلہ طے ہوگیا تو یہاں سے پوری تیاری اور مناسب تدابیر کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں فوجی دستے بھیجے گئے، جو باغیوں کی سرکوبی کرتے۔ حکم کی یہ پالیسی اس قدر کامیاب رہی کہ جلد ہی سندھ کے طول وعرض پر عربوں کا دوبارہ تسلط ہوگیا اور انہیں ایک بڑی فتح ہوئی۔

قاضی اطہر مبارک پوری علامہ بلاذری کے حوالہ سے لکھتے ہیں: حکم بن عوانہ کلبی ایسے وقت میں یہاں کے حاکم بنے کہ بجز ایک قصبے کے پورا ہندوستان کفرستان بنا ہوا تھا، مسلمانوں کے لئے الگ سے کوئی پناہ گاہ نہیں تھی، تو انھوں نے جھیل کے پاس محفوظہ کے نام سے ایک شہر آباد کیا اور اس کو مسلمانوں کی پناہ گاہ قرار دیا۔ محمد بن قاسم کے بیٹے عمر بن محمد بن قاسم اس سفر میں ان کے ساتھ تھے، اور محفوظہ سے انہیں ان کے کاموں اور ذمے داریوں کی اطلاع دیتے رہتے تھے، پھر جب وہ یہاں آئے اور حالات سازگار ہوگئے تو انھوں نے جھیل کے سامنے ''منصورہ'' کے نام سے ایک دوسرا شہر آباد کیا۔ (رجال السند والہند) یہی منصورہ سندھ کا دارالخلافہ تجویز ہوا۔

اب تک عرب میں اموی خلفاء کی حکومت تھی، جن کا دارالسلطنت دمشق تھا۔ ۷۵۰ء میں ان کی جگہ عباسی خلفاء برسراقتدار ہوئے اور بغداد پایۂ تخت قرار پایا۔ عباسی گورنروں میں سب سے کامیاب ہشام تھا، جو ۷۵۷ء میں سندھ آیا۔ فتوح البلدان کے حوالہ سے قاضی اطہر صاحب لکھتے ہیں: امیرالمومنین منصور نے ہشام بن عمرو ثعلبی کو سندھ کا گورنر نامزد کیا، تو اس نے غیر مفتوحہ علاقے بھی فتح کرلئے اور چند چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے ذریعہ عمر بن جمل کو باربد (بھاڑ بھوت) کی جانب روانہ کیا، نیز ہندوستان کے ایک اور علاقہ کی طرف روانہ کیا، قندھار کو اس نے فتح کیا اور ایک مسجد کی بنیاد رکھی۔ قندھار کو آج کل ''گندھارا'' کہتے ہیں، جو ضلع بھروچ گجرات میں واقع ہے۔ نیز ہندوستان کے ایک اور علاقہ کی طرف بھیجا، چنانچہ اس نے کشمیر کو فتح کیا، اسی طرح ملتان کو فتح کیا۔ (رجال

السندوالہند)۔

سندھ میں قریش مکہ کی خودمختار حکومت

فتح سندھ کے ساٹھ ستر سال بعد تک تو عرب فاتحین کا پلہ بھاری رہا،لیکن اب ان میں یمنی اورحجازی جھگڑا شروع ہوگیا،جس نے حکومت کو کمزور کردیا۔جب عرب حاکم اپنے قبائلی اختلافات میں الجھے ہوئے تھے'مقامی قوموں نے سراٹھایا۔چنانچہ شمال سندھ میں جاٹوں نے اورجنوب میں ''مید'' قوم کے لوگوں نے بغاوتیں کیں اورملک کے بعض حصے خودمختار ہوگئے،آہستہ آہستہ خلیفہ بغداد کا اس دور افتادہ مملکت سے برائے نام تعلق رہ گیا،اور ۸۵۴ء میں ہباری خاندان کی موروثی حکومت شروع ہوئی۔ جوابتداء میں تمام مفتوحہ مما لک پر حکمراں تھا۔

اس حکومت کا بانی عمر بن عبد العزیز تھا۔قاضی اطہر مبارک پوری صاحب بلاذری کے حوالہ سے لکھتے ہیں: نزاریوں اور یمانیوں کے درمیان عصبیت کی آگ بھڑک اٹھی تو عمر بن موسی بن یحیی بن خالد برمکی نے یمانیوں کی حمایت کی،عمر بن موسی کو معتصم باللہ نے سرحدی علاقوں کا گوربنایا تھا،اس پر عمر بن عبدالعزیز ہباری نے اس کو جا کر قتل کر دیا۔

بنوہبّار قریشی کی حکومت:

ہبّاریوں کا نسبی سلسلہ اس طرح ہے: عمر بن عبدا لعزیز بن منذر بن زبیر بن عبدالرحمان بن ہبّار بن اسود۔ان کا تعلق قبیلہ قریش کے خاندان بنو اسد سے تھا۔ان کے جدامجد حضرت ہبّار بن اسود نے ۸ھ میں فتح مکہ کے وقت اسلام قبول کیا۔حضرت ہبّار بن اسود رضی اللہ عنہ،ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے چچا مطلب بن اسد بن عبد العزی بن قصی کے پوتے تھے۔حضرت ھبار بن اسود کا نسب نامہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قصی بن کلاب پر جا کر مل جاتا ہے۔(دیکھیں:**اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ: ۵/ ۳۶۰**)

منذر بن زبیر کی اولاد میں سے کوئی حکم بن عوانہ کلبی کے ساتھ سندھ آیا اور منصورہ کے قریب جنوب میں واقع ''بانیہ'' میں سکونت اختیار کی ۔ یہ خاندان پہلے تو اموی حکومت کے ساتھ رہا،مگر بعد میں عباسی خلافت کا وفادار بن گیا۔ جب عمر بن عبد العزیز بن منذر کو

۲۴۰ھ میں والی سندھ بنایا گیا، تو اس نے وہاں خود مختار حکومت قائم کر لی، تاہم اس حد تک خلافت بغداد کا تابعدار رہا کہ خطبہ خلیفۂ عباسی کے نام پر پڑھتا تھا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا عبداللہ بن عمر، ۲۷۰ھ میں سندھ کا حکمراں ہوا، جس نے منصورہ پر تقریباً تیس سال تک حکومت کی۔ عمر بن عبدالعزیز نے پہلے منصورہ کے تخت حکومت پر قبضہ کیا اور اس کے کچھ عرصہ بعد پورے سندھ پر قابض ہو کر ٹیکس وخراج نافذ کر دیا۔ عمر بن عبدالعزیز بن منذر کا دارالحکومت تو منصورہ تھا مگر اس کا قیام ''بیانیہ'' میں رہتا تھا۔ ابن حوقل بغدادی نے اپنی مشہور جغرافیہ کی کتاب ''صورۃ الارض'' کے اندر اس شہر منصورہ کے بارے میں لکھا ہے:

''وملکھم من قریش من ولد هَبّار بن الاسود، قد تغلب علیها أجداده، وساوسوهم ساسیةً أوجبت رغبةالرعیة فیهم، وایثارهم علی من سواهم۔ غیر ان الخطبة لبنی العباس...یقارب زیّهم زی ملوک الهند فی الشعور والقراطق''۔ (کتاب المسالک والمالک لابن حوقل:۲۲۸)

(اہل منصورہ کا بادشاہ قریشی نسل سے ہے، یعنی ہبار بن اسود کی اولاد ہے۔ اس شہر پر اسی قریشی بادشاہ کے بزرگوں نے قبضہ جمایا تھا اور پھر وہاں کے باشندوں پر ان لوگوں نے ایسی حکومت کی کہ رعیت ان کی طرف مائل ہوگئی اور دوسروں پر ان لوگوں کو ترجیح دینے لگے۔ البتہ خطبوں میں عباسیوں کا نام پڑھا جاتا ہے۔......ان کے لباس اور کرتے ہندوستانی راجاؤں کی وضع کے قریب قریب ہیں۔)

سادات اور علویوں کی کثرت:

مسعودی نے ''مروج الذہب:۱۶۸'' میں لکھا ہے: میں منصورہ میں ۳۰۰ھ کے بعد آیا، اس وقت منصورہ کا حاکم ابو منذر عمر عبداللہ تھا، میں نے منصورہ میں اس کے وزیر اباح اور دونوں لڑکوں: محمد بن عبداللہ اور علی بن عبداللہ (ایسے ہی) سادات عرب سے تعلق رکھنے والے ایک شخص، نیز حمزہ کے نام سے مشہور ایک عرب امیر کو دیکھا۔ یہاں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، عمر بن علی، اور محمد بن علی کی اولاد سے تعلق رکھنے والے بہت بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ ''وبہا خلق من ولد علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ثم ولد عمر بن علی وولد محمد

بن علیؓ‘‘۔ [1]

حاکم منصورہ اور قاضی ابوالشوارب کی آل اولاد میں عزیز داریاں، اچھے مراسم اور خاندانی رشتہ داریاں ہیں۔ قاضی ابوالشوارب کی آل کا تعلق ایسے گھرانے سے ہے جس میں ایک عرصہ سے امارت وریاست رہی ہے۔ چنانچہ حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ مکرمہ کا والی مقرر کیا۔ قاضی ابوالشوارب کی نسل میں ایک عرصہ دراز تک منصب قضا رہا، انہی میں محمد بن ابوالشوارب ہیں جو پہلے بغداد کے قاضی رہے اور ۲۸۳ھ میں منصورہ کے قاضی ہوئے۔

قاضی اطہر مبارک پوری صاحب ابن اثیر کے حوالہ سے لکھتے ہیں: تاریخ الکامل میں لکھا ہے کہ قاضی محمد بن ابوالشوارب شہر منصورہ کے چھ ماہ تک قاضی رہے، ان کا خاندان منصورہ ہی میں مقیم رہا۔ مسعودی نے لکھا ہے کہ منصورہ کے تحت کل تین لاکھ بستیاں تھیں، یہ سب ہری بھری، درخت بکثرت اور ان کی عمارتیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔ حاکم منصورہ کے پاس اسّی ہاتھیوں پر مشتمل جنگی ہاتھیوں کا ایک دستہ ہے، ہر ہاتھی کے آس پاس جیسا کہ مجھ سے بتایا گیا کہ پانچ سو پیدل فوج ہوتی ہے اور یہ کئی ہزار سے برسر پیکار ہو جاتے ہیں۔

بنوسامہ بن لوی قریشی کی حکومت:

ابتدا میں پورے علاقہ پر ہباری لوگ حکومت کرتے رہے، لیکن ۹۰۲ء میں ملتان کے بنوسامہ نے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا اور اس وقت عرب مقبوضات ملتان اور منصورہ کی خودمختار ریاستوں میں منقسم ہو گئے، چنانچہ ملتان اور منصورہ ایک دوسرے سے

---

[1] اولاد علی بن ابی طالب کے کثرت سے حجاز چھوڑنے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ حجاج بن یوسف امویوں کا ملازم تھا، اور ہاشمیوں کا بدترین دشمن۔ مشہور ہے کہ اس نے پچاس ہزار افراد کو جو فریق مخالف کے طرف دار تھے، تیغ ظلم وستم کا شکار بنایا۔ چنانچہ جہاں کہیں وہ جاتا؛ بنی ہاشم کے طرف دار ترک وطن پر مجبور ہو جاتے۔ جب وہ عراق کا گورنر ہوا تو ہاشمیوں کی ایک بڑی تعداد یہ علاقہ چھوڑ کر ہندوستان آ گئی۔ (آب کوثر)

علاحدہ ہوگئے۔ ریاست ملتان کے تابع بالائی سندھ کا علاقہ تھا اور منصورہ کے زیرنگیں زیریں سندھ کا۔ یہاں کے حاکم کے بارے میں ابن حوقل نے لکھا ہے:

"امیرھم قرشي من ولد سامة بن لؤی، قد تغلب علیھا اوّلوہ۔ (کتاب المسالک والممالک لابن حوقل: ۲۳۰)۔

(ملتان کا حاکم بھی ایک قریشی ہے، وہ سامہ بن لؤی کی اولاد میں ہے۔ ملتان پر اس کے بزرگوں نے قبضہ کیا تھا۔)

بنو سامہ کی نسبت: سامہ بن لوی بن غالب بن فہر قرشی کی طرف ہے۔ (دیکھیں: الاعلام لزرکلی: ۵)

قاضی اطہر صاحب لکھتے ہیں کہ "تاریخ یعقوبی" میں لکھا ہے: جب سندھ پر ایتاخ کے عامل عنبسہ بن اسحاق کو ایتاخ کے مارے جانے کی خبر ملی تو وہ عراق چلا گیا۔ خلیفہ متوکل باللہ عباسی نے ہارون بن خالد کو سندھ کا عامل مقرر کر دیا، جن کی وفات ۲۴۰ھ میں ہوگئی۔ عمر بن سامی نے متوکل کو لکھا کہ اگر اس کو گورنر بنا دیا جائے تو وہ علاقہ کو کنٹرول کرلے گا، (یہ سامی وہی ہے) جس کی نسبت سامہ بن لوی کی جانب ہے اور جو ملتان کا حاکم تھا۔ متوکل نے اس کی یہ درخواست منظور کرلی اور وہ متوکل کے دور خلافت میں وہاں مقیم رہا۔

مروج الذہب میں ملتان کے تذکرے میں لکھا ہے: حاکم ملتان منبہ بن اسد قرشی، سامہ بن لوی بن غالب کی نسل سے تعلق رکھتا ہے، اس کے پاس طاقت وقوت اور لشکر بہت ہے۔ یہ مسلمانوں کی بڑی سرحدوں میں سے ایک سرحد کا محافظ ہے۔ ریاست ملتان کے تحت ایک لاکھ بیس گاؤں آتے ہیں۔ اصطخری نے "المسالک والممالک" میں لکھا ہے کہ ملتان سے باہر نصف فرسخ کے فاصلے پر بہت سی عمارتیں ہیں، جنہیں "جندراور" کہا جاتا ہے، یہ امیر ملتان کی قیام گاہ ہے۔ امیر صرف جمعہ کے روز یہاں سے ہاتھی پر سوار ہوکر ملتان جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوا کہ راجگان ہند نے بنومنبہ (سامہ بن لوی کی نسل کو بنومنبہ کہا جاتا ہے) پر حملہ کیا، لشکر جرار لے کر ملتان تک آگئے مگر غلبہ بنومنبہ ہی کو حاصل رہا۔ اس لئے کہ بنومنبہ کی دولت، قوت وطاقت بہت زیادہ ہے۔ مبنہ بن اسد قرشی کے بعد اس کا لڑکا

ابولہاث بن منبہ بن اسد قرشی حکمران بنا۔

مقدسی کا بیان ہے کہ ملتان منصورہ ہی کی طرح ہے، مگر منصورہ کی بہ نسبت زیادہ آباد ہے۔ ملتان میں پھل کم ہوتے ہیں، مگر بہت سستے ملتے ہیں، ایک درہم میں تیس روٹیاں مل جاتی ہیں۔ یہ بہت خوبصورت شہر ہے، اس کی عمارتیں؛ سیراف کی عمارتیں جیسی ہیں۔ ساگوان کی لکڑی کی کئی منزلہ عمارتیں ہیں۔ اہل ملتان میں نہ تو زنا کاری کا وجود ہے نہ ہی شراب نوشی کا۔ اگر کسی کو اس میں مبتلا پاتے ہیں تو اسے قتل کر دیتے ہیں، یا حد جاری کرتے ہیں۔ خرید وفروخت میں یہ لوگ نہ تو دروغ گوئی اور جھوٹ سے کام لیتے، نہ ہی ناپ تول میں کمی کرتے ہیں۔ پردیسیوں جن کی غالب اکثریت عربوں پر مشتمل ہے؛ ان سے بہت محبت کرتے ہیں۔ خوش حالی عام ہے، اور بادشاہ انصاف پسند ہے، بازار میں ایک بھی عورت بے پردہ نظر نہیں آتی اور نہ ہی برسر عام کوئی شخص کسی عورت سے بات چیت کرتا ہے، یہاں تجارت بڑی نفع بخش ہے لوگوں کی صحت اچھی رہتی ہے۔ (رجال السند والہند) آگے قاضی صاحب لکھتے ہیں: مذکورہ بالا تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ بنومنبہ کی سیاست کتنی اچھی اور ان کی سیرت وکردار کتنا بلند تھا، نیز یہ کہ ملک اور اہل ملک پر اسلامی احکام کا نفاذ کس حد تک تھا۔

نامور قریشی بزرگ شیخ بہاء الدین زکریا:

آگے چل کر قطب الدین ایبک اور سلطان التمش غیرہ کے زمانہ میں ملتان کے اندر والیان منصورہ کے خاندان میں ایک بہت بڑے بزرگ شیخ زکریا بن محمد بہاء الدین ملتانی گزرے ہیں۔ وہ نہایت قانع، صابر وشاکر اور اللہ کے ان بندوں میں تھے، جن کی زندگی ارشاد خداوندی ''یا ایھا الناس کلوا من الطیبات و اعملو اصالحا'' کی عملی تفسیر تھی۔ آپ ہندستان میں سہروردیہ سلسلے کے مؤسس تھے۔

شیخ بہاء الدین کا نام ونسب اس طرح ہے: شیخ الاسلام بہاء الدین ابومحمد زکریا بن شیخ وجیہ الدین بن محمد بن شیخ کمال علی قریشی اسدی ملتانی۔ تاریخ فرشتہ میں ان کی بابت لکھا ہے: ھبار بن اسود بن مطلب بن اسد بن عبد العزی بن قصی کی اولاد میں سے ہیں۔ ھبار

نے اسلام قبول کرلیا تھا اوران کے تین بھائی: زمعہ، عمر اور عقیل غزوہ بدر میں بہ حالت کفر مارے گئے تھے۔

قاضی اطہر صاحب لکھتے ہیں: والیان منصورہ انہی ھبار بن اسود کی نسل سے تعلق رکھتے تھے، بہاء الدین ملتانی کے دادا کمال الدین علی مکہ مکرمہ سے خوارزم اور خوارزم سے ملتان آکر وہیں سکونت پذیر ہوگئے، اوران کے والد ''وجیہ الدین بن محمد'' ملتان سے کوچ کرکے ''حصار کوٹ کرور'' آکرآباد ہوگئے، یہیں صاحب تذکرہ زکریا بن وجیہ الدین کی ۵۷۸ھ(۱۱۷۲ء) میں ولادت ہوئی۔ جب بارہ سال کی عمر میں قرأت سبعہ کے ساتھ قرآن کریم کا حفظ انھوں نے مکمل کرلیا تو ان کے والد کی وفات ہوگئی۔ اس کے بعد انھوں نے کسب فیض اور تحصیل علم کی خاطر ممالک اسلامیہ کے اسفار کئے، یہاں تک کہ علوم ظاہر اور علوم باطن دونوں کے جامع بن گئے، اوراجتہاد کے مرتبے تک پہونچ گئے۔ علماء بخارا انہیں بہاء الدین فرشتہ کہتے تھے۔ پانچ سال مکہ مکرمہ میں رہے اور مکہ مکرمہ کے شیخ وقت اور مشہور ومعروف محدث سے حدیث کا سماع کیا، پھر بغداد گئے اور شیخ شہاب الدین سہر وردی کی صحبت اختیار کرلی۔ شیخ سہروردی نے جب انہیں دیکھا تو خوش آمدید کہہ کر استقبال کیا اور فرمایا: بہاء الدین! اب سے بارہ سال پہلے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے یہ بشارت دی تھی کہ تمہارے پاس بہاء الدین ملتانی آئیں گے، تو تم ان کو خرقۂ خلافت دے دینا۔ لو اب اس سعادت کا وقت آن پہنچا ہے، پھر صرف سات دن بعد ہی انہیں خرقہ خلافت سے سرفراز کر دیا۔ (رجال السند والہند)

خلعت خلافت سے سرفراز کرنے کے بعد بالغ نظر مرشد نے آپ سے فرمایا کہ اب آپ ملتان جائیں، اوروہاں اقامت اختیار کرکے وہاں کے لوگوں کو منزل مقصود تک پہنچائیں۔ (سیر العارفین:۱۰۹) چنانچہ آپ ملتان آئے اور جلد ہی وہاں بڑا اعتبار واقتدار حاصل کرلیا، بلکہ ملتان، سندھ بلوچستان کے علاقے کو آپ کی روحانی سلطنت سمجھا جاتا ہے۔ آپ کا وعظ سن کر ملک سندھ اور علاقہ ملتان اور لاہور کے ہنود میں سے بھی بے شمار خلقت نے، جن میں بہت متمول تاجر اور بعض والیان ملک بھی تھے، دین اسلام اختیار کیا

اورحضرت کے مرید ہوئے۔اس کے علاوہ حضرت نے عامہ خلق کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے زراعت اور تجارت کے کام کو رفتہ رفتہ بڑھایا، اطراف ملتان میں جہاں کہیں اچھا موقع ہوا؛ افتادہ جنگلوں کو آباد کرایا، کوویں اور نہریں جاری کرائیں، اور تجارت کی طرف بھی بہت توجہ فرمائی۔(انوار غوثیہ بحوالہ آب کوثر)

شیخ کے یہاں بہت بڑی مقدار میں ہدایا اور نذرانے آتے رہتے تھے، جنہیں آپ فقراء ومساکین پر خرچ کردیا کرتے، ایک دفعہ ملتان میں شدید قحط پڑا، اور والی ملتان کو اناج کی سخت ضرورت پڑی۔اس نے شیخ صاحب سے غلہ مانگا تو آپ نے اناج کا ایک بڑا ڈھیر عنایت فرمایا۔جب والیٔ ملتان کے آدمی اناج لینے گئے تو انہیں ڈھیر کے نیچے سونے سے بھرے ہوئے سات پیالے ملے، وہ انہیں بھی لے کر چلے گئے۔جب حاکم ملتان نے دیکھا تو شیخ کی خدمت میں اس کی اطلاع بھجوائی اور معلوم کیا کہ ان کا کیا کیا جائے؟ اس پر آپ نے فرمایا کہ مجھے معلوم تھا کہ ڈھیر کے نیچے دنیا بھی ہے، ہم نے جو کچھ وہاں تھا، سارا ہبہ کردیا اور ہدیہ دے کر واپس نہیں لیا کرتے، لہذا یہ سونا بھی تمہارا ہے۔(رجال السند والہند) آپ کی وفات ۶۶۱ھ بمطابق ۱۲۶۲ء میں ہوئی، مزار خاک پاک ملتان کی سب سے بڑی زیارت گاہ ہے۔

آپ کے جانشین آپ کے صاحب زادے شیخ صدر الدین قریشی، پھر پوتے شیخ رکن الدین ہوئے؛ جو بلاواسطہ آپ کے خلیفہ تھے۔اپنے زمانہ میں شیخ رکن الدین کو بڑا عروج حاصل تھا، سلطان علاء الدین خلجی آپ کا بڑا معتقد تھا، اس کی زندگی میں آپ دو دفعہ دہلی آئے۔ اسی خاندان کے ایک بزرگ شیخ اسماعیل قریشی نے اپنا مستقر الہ آباد کے علاقہ بمرولی کو بنالیا تھا، بمرولی ہی میں آپ کی وفات ہوئی، یہاں آج بھی آپ کا مزار معروف ومشہور ہے۔

قرامطی فتنہ اور سلطنت غزنوی کا قیام

اس زمانہ میں اسماعیلی (شیعہ) عقائد کے لوگ جنہیں قرامطی کہتے ہیں، مصر اور شام پر قابض تھے، اور قاہرہ میں انہی عقائد کے ماننے والے فاطمی خلفاء کی حکومت تھی۔ بغداد اور مشرقی علاقہ عباسیوں کے ماتحت تھے، جن سے فاطمیوں کی سخت عداوت تھی۔ چنانچہ

قرمطی داعی اور مبلغ، عباسیوں کے علاقوں میں جا کر اپنے مذہب اور فاطمیوں کی بیعت کی تلقین کرتے تھے۔ دور افتادہ سندھ بھی ان کی کوششوں کا بڑا مرکز بن گیا۔ پہلا اسماعیلی داعی: ۲۷۰ھ مطابق ۸۸۳ء میں سندھ آیا اور اپنے مذہبی اور سیاسی خیالات کی اشاعت میں مشغول ہو گیا۔ اس کے بعد دوسرے داعی آئے اور ملک کو انقلاب کے لئے تیار کرتے رہے، جب ان کی کوششیں کامیاب ہوتی نظر آئیں تو قاہرہ سے جلم بن شیبان کو فوجی مدد کے ساتھ بھیجا گیا، جس نے ۹۷۷ء میں ملتان پر اچانک حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ اب ملتان میں فاطمی خلفاء کا سکہ اور خطبہ جاری ہوا، اور قرامطی عقائد کی تبلیغ شروع ہوئی۔ ملتان میں اس زمانہ میں ایک بڑا مندر تھا، جس میں ایک قدیم مورتی تھی۔ محمد بن قاسم نے اس مندر کو برقرار رہنے دیا تھا، اور اس کے قریب ایک نئی جامع مسجد تعمیر کی تھی، لیکن قرامطیوں نے وہ مسجد تو بند کرا دی اور مندر کو گرا کر اس کی جگہ ایک دوسری جامع مسجد تعمیر کی۔ سلطان محمود غزنوی کو والئی ملتان کی بدنیتی، بداعتقادی اور کفر والحاد کا جب علم ہوا تو اس کی غیرت جوش میں آئی اور والئی ملتان کے پھیلائے مذہبی و اعتقادی شر کا قصہ تمام کرنے کی ٹھان لی۔

امیر سبکتگین:

محمود غزنوی کے والد امیر سبکتگین کے ہاتھ ۹۷۶ء میں جب غزنی حکومت کی زمام آئی، تو اس وقت ہندوستان کے احوال کچھ اس طرح تھے: یہاں بدھ مت کو زوال ہو چکا تھا، اقتدار پر راج پوتوں کا قبضہ تھا، اور دیش پر برہمنوں کا اجارہ۔ پورا ملک چھوٹے چھوٹے دیسوں میں بٹ کر جنگجو راجاؤں اور ان کے سرداروں کا مستقل میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ شمال مغرب میں پنجاب سے کشمیر تک برہمنوں کی حکومت تھی، دہلی پر توماروں کی، قنوج اور کاشی میں پرتی ہاروں کی، مہوبا اور کالنجر میں چندیلوں کی، مالوہ میں پارمروں کی، ملتان میں قرمطیوں کی، اور گجرات میں سولنکیوں کی حکومتیں تھیں۔ ملک کے دوسرے حصوں مثلاً، گڈھ اور بھوج پور وغیرہ میں ایسی ہی جاگیردارانہ ریاستیں تھیں۔ اس وقت کابل اور پشاور کا علاقہ پنجاب کے راجا جے پال کے زیر نگیں تھا۔ افغانستان میں امیر سبکتگین

اور راجا جے پال دونوں کی سرحدیں ملتی تھیں۔ جے پال کو سبکتگین کی کشور کشائی ناگوار ہوئی تو وہ ایک لشکر کے ساتھ غزنی کی طرف بڑھا، لمغان اور غزنی کے درمیان ۹۷۹ء میں جنگ ہوئی، جس میں جے پال نے شکست کھائی اور اسے صلح کے لئے مجبور ہونا پڑا۔ صلح اس شرط پر ہوئی کہ جے پال اپنے ملک میں واپس جا کر گھوڑے، ہاتھی، مال و جواہر جن کی تعداد عہد نامہ میں متعین ہوئی تھی؛ امیر سبکتگین کے کارندوں کے ہاتھ غزنی بھیجے گا۔

لاہور پہنچ کر جے پال اپنا وعدہ بھول گیا، بلکہ امیر کے آدمیوں کو قید کرلیا۔ سبکتگین کو یہ پتا چلا تو اسے بڑا طیش آیا۔ اس نے جگہ جگہ فوجیں جمع کیں اور جے پال کے علاقہ پر ہلہ بول دیا۔ امیر کو بہت سا مال واسباب ہاتھ آیا۔ لیکن جے پال بھی غافل نہ بیٹھا تھا۔ اس نے خطوط بھیج کر ہندوستان کے تمام راجوں مہاراجوں سے مدد مانگی۔ اور جب پشاور کے مقام پر دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو دہلی، اجمیر، کالنجر اور قنوج کی منتخب فوجیں راجا جے پال کے ہمرکاب تھیں۔ یہ پہلا موقع تھا جب شمالی ہندوستان کے تمام حکمراں متحد ہو کر مسلمان حملہ آوروں کو روکنا چاہا، اور ہندوستانی فوج کی اس قدر کثرت تھی کہ سبکتگین کے سردار گھبرا گئے۔ لیکن اس کے باوجود وہ بھانپ گیا کہ خاص داؤ پیچ اور نئے طریقے سے لشکر آرائی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ایک تو اس نے اپنے سرداروں کو بلا کر جہاد کی ترغیب دی، اور بہادروں کے کارنامے سنا کر ان کے دل بڑھائے، اور دوسرے اپنے لشکر کو پانچ پانچ سو کے دستوں میں تقسیم کیا، تاکہ جب ایک دشمن سے لڑتا لڑتا تھک جائے تو پانچ سو تازہ دم سپاہیوں کا دوسرا دستہ مقابلے میں ڈٹ جائے اور دشمن پر اپنی کمزوری عیاں نہ ہو۔ جب کچھ دیر اس طرح لڑائی رہی اور دشمن کی صفیں ڈھیلی پڑ گئیں تو تمام دستوں نے یکبارگی پورے زور کا حملہ کیا اور اس انبوہ عظیم کو راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔

جے پال نے غزنی پر حملہ کر کے بھڑوں کے چھتا میں ہاتھ ڈالا تھا، اب یہ حالت ہوگئی کہ ''میں تو کمبل کو چھوڑتا ہوں، لیکن کمبل ہی مجھے نہیں چھوڑتا''۔ سبکتگین پر ہندو راجاؤں کی کمزوری پوری طرح ظاہر ہوگئی تھی، اس نے جے پال کو دو ایک اور شکستیں دے کر کابل اور پشاور کا سارا علاقہ اس سے چھین لیا۔ اور پشاور میں اپنا ایک نائب متعین کر کے اپنے

مقبوضات غزنی میں داخل کرلیا۔سلطان سبکتگین کی وفات ۹۹۷ءمیں ہوئی۔

سلطان محمودغزنوی:

سبکتگین کی جگہ ان کا لڑکا محمودغزنوی تخت نشین ہوا۔اس نے ہندوستان میں تقریباً سترہ جنگیں لڑیں، یہ لڑائیاں ان جنگوں کے سواہیں جواس نے افغانستان اورخراسان میں لڑیں۔اس کی فتوحات کا سلسلہ سکندراعظم کی یادتازہ کرتا ہے۔اس نے جے پال سے جنگ جاری رکھی،اور۱۰۰۱ءمیں اٹک کے قریب اسے شکست دی۔جے پال کے بعداس کا بیٹا انند پال تخت نشین ہوا،اس نے بے سمجھی سے:۱۰۰۵ءمیں جب محمود ملتان میں اسماعیلی حاکم ابوالفتح داؤد کے خلاف لشکرکشی کررہا تھا،محمود پرحملہ کردیا۔

قاضی اطہر صاحب تاریخ یمینی کے حوالہ سے لکھتے ہیں: سلطان محمود کو والی ملتان ابوالفتوح کی خباثتوں کاعلم ہواتواس نے اس فتنے کے استیصال کاارادہ کیا۔اس سلسلے میں اس نے اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرنے کے بعد جنگی سازوسامان تیارکرنے،لشکرجمع کرنے اورگھوڑے فراہم کرنے کااعلان کردیا۔باضابطہ فوج کے علاوہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعدادرضاکارانہ طورپرجذبہ جہاداورشوق شہادت میں محمودغزنوی کے ساتھ شامل ہوگئی۔ جب محمودغزنوی بدباطن والئ ملتان کی سرکوبی اورسرزنش کی خاطرفوج اوررضاکاروں کے ایک جم غفیر کے ساتھ ''ملتان'' کے لئے روانہ ہوا،اس وقت دریاؤں میں طغیانی تھی، دریائے سیحون اوران ندیوں کوعبورکرنا دشوارگزارمرحلہ تھا،اس لئے محمود نے ہندوستان کے مہاراجہ انند پال سے درخواست کی کہ ''ملتان'' کے لئے وہ اپنے قبضہ والے علاقوں سے راہداری فراہم کرے۔مگراس نے ایسا کرنے سے یکسرمنع کرکے آمادہ جنگ ہوگیا۔یہ صورت حال دیکھی تومحمود غزنوی نے یہی بہترسمجھا کہ پہلے انند پال سے ہی نمٹ لیاجائے۔اس کی طاقت ختم کرکے اس کی فوج کومنتشرکردیا جائے۔اس طرح دوجنگوں کا ثواب اورمال غنیمت حاصل ہوجائے گا۔چنانچہ بھرپورحملہ کرکے''انند پال'' کے لشکرکوتہہ تیغ کردیا،مال واسباب لوٹ لئے،اورقلعوں وغیرہ کونذرآتش کرکے مصیبت درمصیبت میں مبتلاکردیا۔چنانچہ اس نے راہ فراراختیارکرتے ہوئے کشمیر میں پناہ لی۔ادھروالی

ملتان ابوالفتوح باطنی کو جب انند پال کی اس درگت کا حال معلوم ہوا تو اس نے بعجلت تمام اپنا سارا مال واسباب ہاتھیوں پر لاد کر ''ملتان'' کو محمود غزنوی کے رحم وکرم پر چھوڑ کر سرندیپ کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔(رجال السند والھند)

اگلے سال محمود غزنوی نے انند پال کو عداوت ودشمنی کی مزید سزا دینے کا ارادہ کیا اور پشاور کے قریب اس کے عظیم لشکر کو شکست دے کر ہندوستان میں داخل ہوا اور کانگڑ تک چڑھ آیا غزنویوں اور راجاؤں میں یہ دوسرا معرکہ تھا، انند پال کے ساتھ اس لشکر میں نہ صرف اجمیر ،قنوج ،اور کالنجر ، بلکہ اجین اور گوارلیا کی فوجیں بھی تھیں۔افغان حملہ آوروں کے خلاف عوام میں بھی بڑا جذبہ تھا، بالخصوص کھوکھروں میں ،جن کی عورتوں نے زیور بیچ بیچ کر لشکریوں کی مدد کی تھی۔اس کے بعد محمود نے ہندوستان پر متعدد حملے کئے اور گجرات ، کچھ ،تھانیسر ،نارین ، متھرا اور قنوج سے بہت سا مال غنیمت لے کر واپس ہوا۔محمود کی مسلسل فتوحات نے راجپوتوں کا شیرازہ منتشر کر دیا تھا۔شروع شروع میں تو جے پال کی حمایت میں سارے ہندوستان کے راجے مہاراجے جمع ہوئے تھے،لیکن بعد میں جس مہا راجے کے خلاف سلطان چڑھائی کرتا ،اسے کسی طرف سے مدد نہ ملتی اور بعض جگہ تو سلطان کا ایسا رعب چھایا ہوا تھا کہ اس کی آمد کی خبر سن کر ہی راجا دارالسلطنت چھوڑ کر فرار ہو جاتا۔ ایسی حالت میں محمود اپنی حکومت قائم کر سکتا تھا،مگر اس نے ان مقامات پر کوئی حکومت قائم نہ کی ،اخیر میں لاہور کی حکومت اپنے غلام ایاز کو دے گیا۔

محمود غزنوی کے جانشین:

محمود غزنوی کی وفات: ۱۰۳۰ء میں ہوئی،اس کے بعد مسلمان شاہی خاندانوں کی قدیم روش کے مطابق بیٹوں میں جنگ ہوئی ، بالآخر مسعود غالب آیا۔لیکن اسے بہت دنوں تک حکمرانی نصیب نہیں ہوئی۔ لاہور میں اس کا نائب نیالتگین تھا،کسی غلط شکایت سے متاثر ہو کر مسعود نے تلک کے زیر قیادت نیالتگین کے خلاف فوج بھیجی ،اور نیالتگین شکست کھا کر مارا گیا۔اس کے بعد مسعود نے خود ہندوستان آ کر ہانسی کا قلعہ فتح کیا،لیکن اس کی عدم موجودگی میں سلجوقیوں نے غزنی علاقہ کو تباہ وبرباد کر دیا اور اس کے ترکی وہندی

غلاموں نے بغاوت کر کے اس کے چھوٹے بھائی محمد غزنوی کو تخت نشین کر دیا۔اس کے بعد غزنی میں کئی کمزور اور بے اثر حکمراں ہوئے،جن میں سلطان مودود غزنوی، بہرام شاہ اور خسرو وغیرہ ہیں۔

کیمبرج ہسٹری میں لکھا ہے کہ: مودود کے زمانہ میں دہلی کے راجہ مہی پال نے مسلمانوں سے ہانسی،تھانیسر اور کانگڑھ کے علاقے چھین لئے بلکہ لاہور پر چڑھائی کی، لیکن مسلمانوں نے جم کر مقابلہ کیا اور مہی پال کو واپس لوٹنا پڑ۔اسی طرح ایک واقعہ ملتا ہے کہ بہرام کے زمانہ میں سلاطین غزنی اور سلاطین غور کے مابین فساد کی وجہ سے پنجاب کی حکومت بہت ضعیف ہوگئی۔اس وقت جے پال کا بیٹا راجا اننگ پال نے لاہور پر قبضہ کرلیا تھا،تو غزنی سے لشکر آیا،جس کی وجہ سے اننگ پال کو بھاگنا پڑا۔(**حديقة الاولياء**، بحوالہ آب کوثر) بہرام کا بیٹا خسرو شاہ علاء الدین غوری سے شکست کھا کر غزنی چھوڑ کر ہندوستان آ گیا،اور جب اس کے بیٹے خسرو ملک کو سلطان محمد غوری نے ۱۱۸۶ء میں شکست دے کر لاہور پر قبضہ کرلیا تو غزنویوں کا سارا علاقہ غوریوں کے زیر نگیں آ گیا۔

پرتاپ گڑھ میں اسلام کی آمد

پرتاپ گڑھ میں اسلام کی آمد غزنوی دور میں ہوئی،اس علاقہ میں سب سے پہلے اسلام کی شمع روشن کرنے والے مبلغ مجاہد اسلام سید مسعود سالار غازیؒ اوران کے ساتھ آنے والے مجاہدین تھے۔

ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں آپ کی بابت لکھا ہے:''**ان محمد شاہ تغلق سار لزیارة الشیخ الصالح البطل سالار مسعود الذی فتح أکثر تلک البلاد۔ وله اخبار عجیبة وغزوات شهیرة۔**''(رحلہ ابن بطوطہ:۲/۵۰۵)

(شاہ محمد تغلق نے بطل جلیل مجاہد مسعود سالار غازی کی قبر کی زیارت کیلئے بہرائچ کا سفر کیا۔سالار مسعود نے بہرائچ اوراس کے آس پاس کے اکثر علاقوں کو فتح کیا تھا۔ان کے عجیب وغریب واقعات اورغزوات مشہور ہیں۔)

سید مسعود سالار غازیؒ، سلطان محمود غزنویؒ کے بھانجے تھے،آپ کے والد ساہو سالار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے محمد ابن الحنفیہ کی اولاد میں سے تھے۔ محمود غزنویؒ نے ان سے اپنی بہن کا عقد کردیا تھا۔جن سے سالار مسعود غازیؒ پیدا ہوئے۔ مسعود سالار غازیؒ نے عربوں،ترکوں اورافغان مبلغوں کا ایک جتھا لے کر ہندوستان کا رخ کیا،یہ لوگ دلی کی طرف بڑھے اورکئی مقامات پر جہاد کیا، یکے بعد دیگرے بہت سی جگہوں پران کو فتح ملی، چنانچہ قنوج، بہرائچ،سترکھ(بارہ بنکی)اور مانک پور(پرتاپ گڑھ) وغیرہ میں فتح کا جھنڈا لہرایا۔اس زمانہ میں مانک پور کڑے، ریاست قنوج کے ماتحت تھا، چنانچہ فتح قنوج کے بعد قدرۃً مانک پور پر قبضہ ہوگیا،فتح کے بعد سالار مسعود غازی نے

قطب حیدر کو اپنا نائب منتخب کیا اور یہاں کا انتظام و انصرام اس کے سپرد کیا۔

کچھ دنوں بعد متعدد راجاؤں کا ایک لشکر سالار مسعود کے خلاف صف آرا ہوا، اور انھوں نے ہر طرف سے غازی میاں کے ساتھیوں کو گھیر لیا، اس وقت ان کے مجاہدین دور افتادہ مقامات پر بکھرے ہوئے تھے، نہ کوئی بڑا لشکر آپ کے ساتھ تھا اور نہ باہر سے کسی فوج کی مدد آرہی تھی، اسی حالت میں بہرائچ کے اندر لڑائی شروع ہوگئی، آہستہ آہستہ غازی میاں کی قوت گھٹتی گئی، بالآخر آپ نے اپنے رفقاء کے ہمراہ ۱۰۳۳ء میں جام شہادت نوش کیا۔ (مرآۃ مسعودی)

علاقہ کی عوام مسلم ہو یا غیر مسلم آج بھی غازی میاں کا نام بڑے ادب و احترام سے لیتی ہے۔ علاقے کے بہت سے غیر مسلم غازی میاں کے نام سے روزہ رکھتے ہیں اور ان کے نام کی منتیں مانتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ علاقہ میں غازی میاں کے نام سے پائی جانے والی قبریں آپ ہی کے مجاہدین شہداء کی ہیں۔ مانک پور پرتاب گڑھ میں آپ نے قطب حیدر کو ذمہ دار بنایا تھا، ان کو بھی راجاؤں نے گرفتار کر کے شہید کر دیا تھا۔ غالباً مانک پور کڑے میں ہونے والا ''بِٹّیَن'' کا میلہ خاص انہیں قطب حیدر کی شہید بچیوں اور عورتوں کی یاد میں منایا جاتا ہے، جنہیں بعد میں یہاں کے سرداروں نے بڑی بے دردی سے شہید کر دیا تھا۔

چونکہ سالار مسعود غازی اور ان کے رفقاء کی یہ فتوحات اس علاقہ میں بالکل ابتدائی دور میں تھیں اور ان حضرات کی شہادت کے بعد ایک زمانہ تک مسلمانوں نے ادھر کا رخ نہیں کیا، اس لئے ان کے کارناموں کی تفصیلات اور شہداء وغیرہ کے حالات صحیح طور پر مرتب نہ ہو سکے۔ سالار مسعود غازیؒ کے اکثر ساتھی ان کے ہمراہ شہید ہو گئے اور جو لوگ بچے؛ وہ ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ چنانچہ ''لچھمن پور'' لکھنؤ میں ایک علاقہ تھا، بعد میں اسی نام سے لکھنو شہر بسایا گیا، وہاں شیوخ کے ایک خاندان کے بارے میں تاریخ اودھ کے اندر لکھا ہوا ہے کہ وہ سالار مسعود غازی کے ہمراہ یہاں آکر آباد ہوا۔ (تاریخ اودھ ۱/ ۳۹)

ایسے ہی جائس کے شیخ زکریا ہاشمی کی بابت لکھا ہے کہ وہ بھی سالار مسعود غازی کے زمانہ میں آئے تھے۔ صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں:

’’ان زکریا الھاشمی وفدالھند مرافقاًللسید سالار مسعود الغازی وغزی الھندو فتح جائس‘‘۔(معیارالانصاب نزہۃ الخواطر ا / ۱۱۲)

(زکریاہاشمی سید مسعود سالار غازی کے ہمراہ ہندوستان آئے،انھوں نے یہاں جہاد کیااور جائس کو فتح کیا۔

گزیٹیر پرتاپ گڑھ 1908ء میں لکھا ہے:

The hindu rulers of manikpur were said to be subordinates reigning dynasty of Kannauj.

it is said that in the bigininigof the 11th century saiyid salar masaud who led a conquring expedition into avadh,captured Manikpur and left it in the charge of Qutub Haider.

(ترجمہ:مانک پور کے ہندوحکمرانوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سلطنت قنوج کے ماتحت تھے۔بتایا جاتا ہے کہ گیارہویں صدی عیسوی کے ابتداء میں مسعود سالار غازی لشکرکشی کرتے ہوئے اودھ آئے،اور مانک پور پر قبضہ کرلیا،اس کا انتظام اوانصرام قطب حیدر کے حوالہ کیا۔(گزیٹیر ۱۹۰۸ء)

شہر پرتاپ گڈھ سے متصل گاؤں ’’بھلیاپور‘‘ میں آباد قریش خاندانوں کی بابت ۱۸۶۲ء کے واجب الارض میں درج ہے:’’ہم لوگ اہل قریش رئیسان عرب ہیں۔ایام ورودفوج سلطان محمود کے ہمارے مورث ساتھ تھے۔‘‘(واجب الارض ۱۸۶۲ء، پرتاپ گڑھ)

---

[۱] واضح رہے کہ’’ورودفوج سلطان محمود‘‘ سے مراد سلطان محمود کا وہ لشکر ہے جو سلطان کے بھانجے مسعود سالار کے ہمراہ بغرض جہاد آیا تھا۔(سلطان محمود غزنوی بذات خود اس علاقے میں کسی مہم پر نہیں آئے) اس علاقے میں مسعود سالار غازی کے آنے کا تذکرہ ابن بطوطہ، ابولفضل، داراشکوہ اورابوالقاسم فرشتہ وغیرہ سبھی نے کیا ہے،البتہ آمد کی تاریخ کی بابت اختلاف ہے،بعض کہتے ہیں کہ سلطان محمود غزنوی کے

زمانہ ہی میں وہ یہاں آئے تھے اور بعض ان کی وفات کے بعد کے قائل ہیں۔ ابوالفضل نے لکھا ہے: خویشاوند سلطان محمود غزنوی ست۔ فرشتہ نے لکھا ہے: از اقارب سلطان محمود غزنوی بودہ کہ در عہد اولاد سلطان محمود غزنوی بدست کفار مقتول شد۔ رحلہ ابن بطوطہ کے مترجم مولوی محمد حسین شہر "بیانہ" کی بابت کنگھم کے حوالہ سے لکھتے ہیں: بیانہ میں، قبروں میں ابوبکر قندھاری کی قبر بہت مشہور ہے، اور یہ دوہا عوام کے زبان زد ہے:

اگارہ سوتہتر پھاگ تیج ربی دار   بجے مندر گڑھ توڑا ابوبکر قندھار

یعنی پھاگن کے مہینہ میں تیسری تاریخ کو سمبت: ۱۱۷۳ میں ابوبکر قندھاری نے بیانہ کے قلعہ کو فتح کیا، یہ زمانہ: ۵۱۲ھ کے مطابق ہوتا ہے، جو بہرام بن مسعود غزنوی کے جلوس کا سال تھا۔ بہرام کی شروع عملداری میں بھی غزنوی لشکر فتوحات کے لئے ہندوستان میں آیا ہے، چنانچہ روضۃ الصفاء میں درج ہے: وبعد ازاں کہ تخت مملکت متمکن گشت، لشکر بدیار ہند کشید، وبسیار ازاں بلاد کہ اسلاف او بداں موضع نرسیدہ بودند بکشاد۔ پھر مترجم صاحب لکھتے ہیں: میری رائے میں سالار مسعود غازی شاید اسی لشکر کے سردار ہوں، کیوں کہ بیانہ کے قلعے کا فتح ہونا، ان کے ہاتھ پر بیان کیا جاتا ہے۔ (حاشیہ سفرنامہ بن بطوطہ: ۲۷۸)

سلطان محمد غوری اور سلطنت غلاماں کا قیام

محمود غزنوی نے ہندوستان میں کوئی حکومت قائم نہ کی تھی، ہندوستان پر سب سے پہلے اسلامی حکومت قائم کرنے کا خواب سلطان محمد غوری نے دیکھا۔ ہندوستان پر محمود غزنوی کے آخری حملے اور سلطان محمد غوری کی آمد تک دو صدیاں گزر گئیں۔ ان ایام میں بعض مرتبہ راجپوتوں نے لاہور پر حملہ کر کے غزنوی حکمرانوں کو نکالنے کی کوشش کی۔ اور ۱۱۹۳ء میں جب سلطان محمد غوری نے دوسری مرتبہ پرتھوی راج چوہان سے جنگ کی تو اس کے مقابلے میں ایک سو پچاس راجپوت راجے مہاراجے تھے۔

سلطان محمد غوری نے ہی ہندوستان میں پہلی مستحکم اسلامی حکومت قائم کی، اس مقصد کے لئے انھوں نے ضروری سمجھا کہ سرحد پر جو مسلم ریاستیں ہیں، ان پر قبضہ کر لینا چاہئے، چنانچہ اس نے غزنی کی فتح کے بعد ملتان، اچ اور لاہور پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد بھٹنڈرہ کا قلعہ فتح کر کے یہاں اپنی طرف سے حاکم مقرر کیا۔ وہ اس فتح سے واپس غزنی جا رہا تھا تو سرحد کے سردار کی درخواست پہونچی کہ اجمیر اور دہلی کا راجا، بے شمار فوج کے ساتھ بھٹنڈرہ کو مسلمانوں سے چھڑانے کے لئے آرہا ہے، اس کا تدارک لازم ہے، ورنہ جو مسلمان وہاں مقیم ہیں، مارے جائینگے۔ اس وقت سلطان کے پاس پوری فوج نہ تھی، لیکن بھٹنڈرہ کے مسلمانوں کا خیال کر کے اس نے فوراً لشکر کو روک کر اس طرف کا رخ کیا، جدھر سے پرتھوی راج آرہا تھا۔ تھانیسر سے چودہ میل دور ترائن (موجودہ تراوڑی) کے قریب دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا، راجپوتوں نے اس زور سے حملہ کیا کہ مسلمانوں کی صفیں بکھر گئیں اور افغان اور خلجی سپاہی میدان سے بھاگ نکلنے۔

شمالی ہندوستان کی لڑائیوں میں یہ پہلا اہم معرکہ تھا، جس میں مسلمانوں کو ہزیمت کا

سامنا کرنا پڑا، محمد غوری کو اس کا بڑا رنج ہوا تھا۔ چنانچہ اس کا بدلہ لینے کے لئے اس نے دوبارہ تیاری شروع کی اور پورے ساز وسامان کے ساتھ ایک لاکھ سے زیادہ سواروں کو لے کر ہندوستان روانہ ہوا۔ اب ایک بار پھر ترائن کے مقام پر حرب وضرب کا میدان گرم ہوا، اس وقت پرتھوی راج کے ساتھ شمالی ہندوستان کے راجپوت راجے اور ان کی بے شمار فوجیں تھیں اور وہ مارنے یا مرنے کی قسمیں کھائے ہوئے تھے۔ لیکن محمد غوری کی شاندار قیادت کام آئی، شروع میں سلطان کے حکم سے فوجیں پیچھے ہٹتی گئیں، حتی کہ رائے پتھورا کی فوج کو فتح کا یقین ہوگیا اور تعاقب کے جوش میں ان کی صفیں درہم برہم ہوگئیں۔ اس وقت مسلمانوں نے پلٹ کر پھر راجپوتوں پر حملہ کیا، ادھر کچھ تازہ دم فوج جو اب تک لڑائی سے علاحدہ تھی، میدان کارزار میں آئی اور راجپوتوں پر اس زور سے حملہ کیا کہ ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور میدان غوری کے ہاتھ رہا۔

اس فتح نے شمالی ہند کے دروازے مسلمانوں پر کھول دئے، اور دہلی و اجمیر کی حکومت سلطان محمد غوری کے ہاتھ آگئی، چنانچہ ان علاقوں میں مبلغین اسلام کے لئے راہیں آسان ہوگئیں، انھیں ایام میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، حضرت خواجہ حمیدالدین ناگوری اور دیگر بہت سے بزرگوں نے شمالی ہندوستان آکر تبلیغ اسلام کے فرائض انجام دئے۔ ابتداء میں سلطان محمد غوری نے پرتھوری راج کی حکومت کو خراج گزاری پر برقرار رکھا۔ لگتا ہے کہ اسی زمانے کے وہ سکے ہیں جن میں سے بعض پر حروف اور عبارت ہندی زبان میں ہے اور بعض پر سلطان کے ساتھ پرتھوی راج کا نام درج ہے۔

لیکن ۱۱۹۳ء میں جب راجہ نے انحراف کیا تو ریاست کا الحاق کر کے اسے مقبوضات اسلامی میں شامل کرلیا گیا۔ سلطان محمد غوری کے یہاں تعصب کا کوئی جذبہ نہیں تھا، اس نے بہت سی لڑائیاں ہندو راجاؤں کے ساتھ مل کر لڑیں۔ پنجاب کی اکثر لڑائیوں میں جموں و کشمیر کا ہندو راجا اس کے ساتھ تھا۔ اسی طرح ترائن کی دوسری لڑائی میں جب پرتھوی راج کو شکست فاش ہوئی تو قنوج کا طاقتور راجا جے چند سلطان کے پہلو بہ پہلو صف آرا تھا۔ حالاں کہ بعد میں اس نے غداری کی تو اس کو بھی سزا دی، تاہم اس کی ریاست کو

برقرار رکھا، چنانچہ یہ ریاست التمش کے زمانہ تک برقرار رہی۔

قطب الدین ایبک:

ترائن کی لڑائی کے بعد سلطان محمد غوری واپس غزنی چلے گئے اور ہندوستان میں قطب الدین کو اپنا نائب مقرر کیا، جس نے فتوحات اسلامی کا سلسلہ جاری رکھا اور مفتوحہ علاقوں میں نظم ونسق قائم کیا۔ دوسال بعد پھر سلطان محمد غوری آئے اور قنوج کے طاقتور راجا جے چند کو شکست دی۔ اس دوران قطب الدین ایبک نے گجرات، گوالیا، بیانہ اور بختیار خلجی نے بہار اور بنگالہ فتح کر کے اسلامی حکومت میں شامل کردیئے۔ ۱۲۰۶ء میں جب کھوکھر قوم نے بغاوت کی تو پھر سلطان محمد غوری ہندوستان آیا اور انہیں شکست دی۔ یہ بغاوت فرو کر کے سلطان واپس جارہا تھا کہ دریائے جہلم کے کنارے ایک اسماعیلی (شیعہ) نے اسے شہید کردیا۔ سلطان کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی، درباری اس پر تاسف کا اظہار کرتے تو وہ کہتا تھا کہ میرے اتنے غلام ہیں، جنہیں میں نے بیٹوں کی طرح پالا ہے اور جن کی تعلیم وتربیت پر میں نے بے حد محنت کی، وہ سب فرزندوں کی طرح میرا نام روشن کرینگے۔ خدائے تعالی کی نظر میں سلطان کی محنت مقبول ہوئی اور اسکے دلی منصوبوں کو پورا کرنے میں اس کے غلاموں نے وہ کارہائے نمایاں انجام دئے جو بیٹوں سے بھی بن نا آتے۔ انھوں نے خاندان غلاماں کی بنیاد ڈالی اور ہندوستان میں سلطان کا کام جاری کیا۔ سلطان کی وفات کے بعد ترک افسروں نے قطب الدین ایبک کو ہندوستان کا بادشاہ منتخب کردیا۔ وہ محمد غوری کا غلام تھا اور خاندان غلاماں کا بانی۔ اس نے فقط چارسال حکومت کی اور ۱۲۱۰ء میں ایک حادثہ میں وفات پا گیا۔

شمس الدین التمش:

قطب الدین ایبک کی وفات پر اس کا لڑکا ''آرام شاہ'' تخت کا دعویدار ہوا، لیکن امراء نے اس عہدے کے لئے التمش کو چنا، چنانچہ سلطان شمس الدین التمش ۱۲۱۰ء میں قطب الدین ایبک کا جانشین بنکر تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوا۔ التمش سلطان قطب الدین ایبک کے داماد اور آزاد کردہ غلام تھے۔ بڑے ہی نیک سیرت اور رحم دل انسان تھے۔

انھوں نے سندھ، اجین، مالوہ اور گوالیار کو اپنی سلطنت میں شامل کیا۔ ان کے زمانہ میں چنگیزی فتنہ نے پورے عرب کو اپنے نرغہ میں لے رکھا تھا اور مہاجرین کا سیل رواں ادھر ادھر بھٹک کر دردر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور تھا۔ التمش نے نہ صرف ان مہاجرین کے لئے اپنے دروازے کھولے، بلکہ ان کو بڑی عزت اور احترام کے ساتھ اپنے ملک میں قیام کی اجازت دی۔ انھوں نے سلطنت دہلی کی بنیادوں کو مستحکم کیا، منگولوں سے مقابلہ کیا اور ہندوستان والوں کو اس مصیبت عظمیٰ سے بچائے رکھا۔ انھوں نے بیس برس تک ہندوستان پر حکومت کی۔ ۱۲۳۶ء میں التمش کی وفات ہوگئی۔ انصاف کی طرف اس کی توجہ بدرجہ غایت تھی، انھوں نے حکم دے رکھا تھا کہ جس کسی پر بھی ظلم ہو؛ وہ رنگے ہوئے کپڑے پہن کر پھرے تاکہ بادشاہ فوراً اس کو پہچان لے۔

رات کے واسطے یہ تجویز کی تھی کہ اپنے دروازے کے برجوں پر دو شیر سنگ مرمر کے بنے ہوئے رکھے تھے، جن کے گلے میں زنجیریں تھیں اور زنجیروں میں گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں، جب کوئی مظلوم آکر زنجیر ہلاتا تھا تو فوراً بادشاہ کو خبر ہوجاتی تھی اور وہ فواراً اس کے مقدمے کا فیصلہ کرتا تھا۔

التمش کے جانشین:

التمش کی وفات کے بعد ان کا لڑکا رکن الدین وارث تخت وتاج ہوا۔ مگر وہ عیش پرست واقع ہوا۔ وہ بعض امیروں کی بغاوت رفع کرنے کے لئے پنجاب گیا تھا، امراء اس سے تنگ آ گئے تھے، چنانچہ بعض امیر راستے سے واپس دہلی آ گئے اور انھوں نے آکر رضیہ سلطانہ کو تخت پر بٹھا دیا۔ چونکہ رضیہ کے دیگر بھائی ابھی چھوٹے تھے۔ رضیہ سلطانہ نے ہندوستان پر چار سال حکومت کی۔ وہ مردوں کی طرح ہتھیار لگا کر گھوڑے پر سوار ہوا کرتی تھی اور اپنا چہرہ کھلا رکھتی تھی، جب اس پر تہمت لگائی گئی کہ وہ ایک حبشی غلام سے تعلق رکھتی ہے تو لوگوں نے بالاتفاق اسے تخت سے اتار دیا۔ اور کسی قریبی رشتہ دار سے اس کا نکاح کردیا۔ سلطانہ رضیہ کے زمانہ میں قرمطیوں نے دہلی پر یورش کی، لیکن کشت وخون کے بعد شاہی فوج اور مسلمانان دہلی نے انہیں مار بھگایا۔ رضیہ کے بعد اس کا بھائی معزالدین بہرام

شاہ، بادشاہ ہوا۔اس کے بعد رکن الدین کا بیٹا علاء الدین مسعود بادشاہ ہوا۔

سلطان ناصر الدین محمود:

۱۲۴۶ء میں امراء نے علاء الدین مسعود کو ہٹا کر ناصر الدین محمود کو تخت نشین کیا۔وہ ایک درویش طبع بادشاہ تھا، سرکاری خزانہ کو ہاتھ نہ لگاتا اور قرآن شریف لکھ کر روزی کماتا۔ سلطنت کا نظم ونسق اس نے قابل وزیر اور سسر غیاث الدین بلبن کو سونپ رکھا تھا۔انتظام سلطنت بلبن کے سپرد کر کے اسے کہہ رکھا تھا کہ میں نے تمہیں تمام اختیارات دے رکھے ہیں، تم ہرگز کوئی ایسا کام نہ کرنا جس سے کل کو اللہ تعالی کے حضور میں تمھیں اور مجھے شرمندگی اٹھانی پڑے۔وہ خود اپنا اکثر وقت خلوت میں حجرے کے اندر تلاوت اور عبادت میں گزارتا۔وہاں پھٹے پرانے کپڑے پہنتا، البتہ دربار عام کے وقت شاہی لباس زیب تن کرتا۔سلطان ناصر الدین محمود کی حکومت بیس سال تک رہی۔

سلطان غیاث الدین بلبن:

سلطان ناصر الدین کی زندگی ہی میں امور سلطنت کی باگ ڈور اس کے باہمت وزیر بلبن کے ہاتھ میں تھی، اور جب ۱۲۶۵ء میں انھوں نے وفات پائی تو بلبن بغیر کسی مزاحمت کے بادشاہ ہو گیا۔ ہندوستان کے بادشاہوں میں غیاث الدین بلبن ایک خاص رنگ اور شان کا بادشاہ گذرا ہے۔بیس سال خود اور بیس سال تک ناصر الدین کے تابع رہ کر یعنی کل چالیس سال تک ہندوستان پر حکومت کی ہے۔بلبن کا پہلا بڑا کام ملک کا اندرونی نظم ونسق اور سلطنت کا باطنی استحکام تھا۔بلبن نے اولاً سب سے زیادہ توجہ باغیوں اور فسادیوں سے نمٹنے پر دی۔اس کا دوسرا کارنامہ منگولوں کا سد باب تھا، اس کے پیشرو ناصر الدین محمود کے زمانے میں منگول کئی بار ہندوستان آئے۔لاہور کو کئی بار انھوں نے لوٹا اور وہاں کے قلعہ کو تباہ و برباد کیا۔اس زمانے کا سب سے اہم مسئلہ یہی تھا، اس لئے بلبن نے اس جانب زیادہ توجہ کی، خطرہ اب فقط منگولوں کے منتشر دستوں سے نہ تھا، بلکہ ہلاکو خان کی آنکھیں ہندوستان کی طرف اٹھتی تھیں، لیکن بلبن کے سلیقۂ جہانگیری کے سامنے اس کی ہمت نہ پڑی

کہ ادھر قدم بڑھائے۔بلبن نے فوج کی باقاعدہ تنظیم کی،عہدہ داروں اورامیروں کومجبور کیا کہ وہ سپاہی اورسواراوران کا ساز وسامان رکھیں۔سلطنت کی شمال مغربی سرحد پر جابجا قلعے تعمیر کرائے۔لاہور کے قلعہ کو دوبارہ پختہ کیا، اور مغربی پنجاب میں اپنے سب سے قابل اور معتمد جرنیل مقرر کئے،تاکہ وہ سرحد کی حفاظت کریں۔بلبن نے اپنی حکومت کی توسیع کی کوشش نہ کی، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اب اصل کام حکومت کی بنیادیں مستحکم کرنا ہے۔اسے گجرات اور مالوے پر لشکرکشی کا مشورہ دیا گیا،لیکن اس کا جواب تھا کہ میں نہیں چاھتا کہ میں یہاں سے جاؤں اور دہلی کا وہی حال ہو جومنگولوں کے ہاتھوں بغداد کا ہوا ہے۔(کیمبرج ہسٹری بحوالہ آب کوثر)

بغداد کی تباہی و بربادی نے عجیب حالات پیدا کردئے تھے،ہلاکو خان نے تاراج وغارت گری اور کشت وخون میں چنگیز کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ان مما لک سے بے شمار علماء وفضلاء جان بچا کر ہندوستان آئے۔بلبن نے ان کا احترام کیا۔ان کی بڑی قدر کی اوران سے استحکام حکومت میں مدد لی۔

غیاث الدین بلبن ایک متدین اور منصف مزاج بادشاہ تھا،ایک مرتبہ بدایوں کے ایک جاگیردار نے ایک نوکر کو اتنا پٹوایا کہ وہ مرگیا۔جب بلبن بدایوں گیااور مقتول کی بیوہ نے فریاد کی تو بلبن نے جاگیردار کے ساتھ بالکل وہی سلوک کیا جواس نے اپنے نوکر کے ساتھ کیا تھااور جس سرکاری خبررساں نے اس واقعہ کی اطلاع بادشاہ کو نہ دی تھی؛اسے بھی عبرت ناک سزادی۔وہ کہا کرتا تھا کہ اگر میرے بیٹے ایسا کرینگے تو میں ان کے ساتھ بھی یہی سلوک کروں گا۔

بلبن کے جانشین:

بلبن کے دو بیٹے تھے،خان محمد شہیداور بغرخان۔تمام مؤرخین متفق ہیں کہ خان شہید یعنی محمد سلطان نہایت قابل اور ہونہار لڑکا تھا۔اہل علم کا قدرداں اورخود بھی علامہ اور سخن فہم تھا۔شیخ سعدی کے پاس بطور نذر بہت مال بھیجا کرتا تھااورایک دفعہ ان سے ہندوستان میں تشریف لانے کی بھی درخواست کی،لیکن شیخ نے پیرانہ سالی وناتوانی کا عذر کیااوراس کے

پاس اپنے اشعار بھیج دیئے۔ باپ کی ساری امیدیں اسی لائق فرزند سے وابستہ تھیں۔ شہزادہ محمد اپنے باپ کی طرف سے لاہور کا صوبہ دار تھا، اسے سلطنت کی اہم ترین مہم یعنی منگولوں کی روک تھام سونپی گئی تھی، ارغون خان نے جو ہلاکو کا پوتا تھا، تیمور خان حاکم غزنی کو ہندوستان کی تسخیر کے لئے ایک لشکر جرار دے کر بھیجا۔ راوی ندی کے کنارے اس کا اور شہزادے کا مقابلہ ہوا، دشمن کو شکست ہو چکی تھی، مگر شہزادہ ایک تیر کھا کر گر پڑا اور شہید ہوا۔ [١]

محمد خان شہید کی وفات نے بلبن کی کمر توڑ دی، وہ ہمہ تن برضائے قضارہ کر امور سلطنت میں مشغول رہتا تھا اور اپنا درد نہانی لوگوں پر ظاہر نہ کرتا۔ لیکن راتوں کو اٹھ کر بے اختیار روتا تھا۔ چند دنوں کے بعد بادشاہ نے اپنے دوسرے بیٹے بغرا خان کو بنگالے سے بلا بھیجا کہ اب تخت کا وارث تیرے سوا کوئی نہیں، تیرا بیٹا کیقباد اور خان شہید کا بیٹا کیخسرو کم سن ہیں اور امور ملکی سنبھالنے کے قابل نہیں۔ تم ہی آ کر میرا ہاتھ بٹاؤ۔ لیکن جب وہ یہاں آیا تو دیکھا کہ بلبن ابھی چند روز اور جیئے گا تو شکار کے بہانے لکھنوتی واپس چلا گیا۔ بیٹے کی اس بے رخی نے بلبن کی صحت کو اور بھی تباہ کر دیا اور وہ بالکل نحیف و بے جان ہو گیا۔ مرنے سے پہلے اس نے وصیت کی کہ چونکہ بغرا خان بلاد مشرقی کو چھوڑنا نہیں چاہتا، میرے بعد محمد سلطان خان شہید کا بیٹا کیخسرو تخت نشین ہو، لیکن اس کی وفات کے بعد وزیر نے اس وصیت پر عمل نہ کیا اور کیخسرو کے بجائے بغرا خان کے بیٹے کیقباد کے سر پر تاج شاہی رکھ دیا۔ (آپ کوثر)

۞۞۞

---

[١] امیر خسرو بھی اس لڑائی میں خان محمد کے ہمراہ تھے۔ انھوں نے شہزادہ کے مرثیہ میں ایک بے نظیر بند لکھا ہے، جو شیخ سعدی کے مرثیہ مستعصم باللہ کے ہم پلہ ہے۔

واقعہ ہست یا بلا از آسماں پدید
آفت ست ایں یا قیامت درجہاں آمد پدید
راہ در بنیاد عالم داد سیل فتنہ را
رخنہ کا مسال در ہندوستان آمد پدید
مجلس یاراں پریشاں شد جو برگ گل زباد
برگ ریزی گوئی اندر گلستاں آمد پدید

عہدغلاماں میں پرتاپ گڑھ

قطب الدین ایبک مانک پور کے گورنر:

قطب الدین ایبک کے دور ہی میں پرتاپ گڑھ فتح ہوا اور کڑا مانک پور مشرقی علاقوں کا دارالسلطنت بنا۔قطب الدین ایبک کے زمانہ میں مسعود سالار غازی شہیدؒ کی قربانیوں کا رنگ ظاہر ہوا اور یہاں اسلام اور مسلمانوں کا خوب چرچا ہوا۔گو یہ سالار مسعود کا بویا ہوا بیج اگا ہی نہیں بلکہ ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر گیا۔گزیٹئر میں لکھا ہے: کہ ۱۱۹۲ء میں سلطان محمد غوری کے حملے کے وقت ریاست ''گدھ والا'' کی طرف سے ''مانک پور'' پر''مانک چند'' کی حکومت تھی اور''کڑا'' پر اس کے بڑے بھائی جے چند کی۔سلطان محمد غوری نے ان لوگوں کو شکست دے کر صوبہ مانک پور کڑا کو فتح کر لیا۔کڑے کو اس ریاست کا دارالسلطنت بنایا،جس میں پرتاپ گڑھ سمیت پورا علاقہ تھا۔سلطان محمد غوری کے معتمد خاص قطب الدین ایبک کو اس نئے صوبے کا حکمراں قرار دیا گیا۔بعد میں قطب الدین ایبک نے ریاست مانک پور کو بطور جاگیر ایک دامغانی سپہ سالار کے حوالہ کر دیا۔(۱۹۰۸ء، پرتاپ گڑھ گزیٹیر،ص:۲۶)

شاہ قطب الدین الحسینی کی آمد:

اس زمانہ میں بہت سے علمی اور روحانی خانوادوں نے اس دیار کو زینت بخشی۔ مثلاً سید احمد شہید رائے بریلویؒ کے جدامجد حضرت شاہ قطب الدینؒ اسی زمانہ میں ادھر آئے۔آپ اولاً فتح پور ہنسوہ آئے اور وہاں سے بغرض جہاد''کڑا'' کا رخ کیا۔بعد میں اس

خاندان کے لوگ تکیہ رائے بریلی اور قصبہ نصیر آباد منتقل ہوئے۔

شیخ اسماعیل قریشی کی آمد:

سلطان التمش (۱۲۱۱ء-۱۲۲۶ء) کے دور میں (حضرت شاہ حامد مانک پوریؒ کے جد امجد) سید شہاب الدین گردیزی مانک پور میں آکر آباد ہوئے، یہیں ان کی وفات ہوئی، یہیں ان کی قبر بھی ہے۔اسی طرح (شیخ حسام الدین مانک پوری کے جد امجد) شیخ اسماعیل قریشی یمن سے آکر یہاں آباد ہوئے۔(پرتاپ گڑھ گزیٹیر ۱۹۰۸، ص ۲۶)

شیخ اسماعیل قریشی کا نسب خلیفہ دوم حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے۔
حضرت خواجہ حسام الدین مانک پوری رحمۃ اللہ علیہ آپ کے پڑپوتے تھے،اس دیار میں شیخ اسماعیل قریشی فاروقی کے خاندان کو جو قبولیت اور مقام حاصل ہوا، وہ یہاں اور کسی کے حصہ میں نہیں آیا۔اس خاندان میں بڑے بڑے اہل اللہ اور بزرگان دین پیدا ہوئے، شیخ جلال الدین، خوجہ خضر، شیخ حسام الدین، شیخ محمود نتھن، خواجہ سلطان، خواجہ قاسم، خواجہ احمد، شیخ عبداللہ، خواجہ عبدالکریم، خواجہ فیض اللہ، شیخ نظام الدین وغیرہ سب اسی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔(دیکھیں: تذکرہ علمائے پرتاپ گڑھ)

شیخ حسام الدین مانک پوری کو اللہ تعالی نے ایسی مقبولیت عطا فرمائی کہ اس وقت کے اولیاء و علماء ان سے وابستگی کو اپنے لئے سعادت عظمی سمجھتے تھے، شاہان وقت ان سے اپنی نسبت پر فخر کیا کرتے تھے، سلطان سکندر لودھی خود آپ کے ہاتھ پر بیعت تھا اور آپ کے دربار میں حاضری دیتا۔ہندوستان کے عظیم فرمانروا شیر شاہ سوری نے اپنی بیٹی کا عقد آپ کے پڑپوتے خواجہ محمد قاسم سے کیا تھا۔آپ کے ایک خلیفہ حضرت خواجہ حامد شاہ مانک پوری ہیں، جو شیخ شہاب الدین کی اولاد میں تھے۔

شہاب الدین گردیزی کی آمد:

جیسا کہ گزیٹیر میں لکھا ہے کہ شہاب الدین بھی اسی زمانہ میں یہاں آکر آباد ہوئے۔
شیخ کی بابت قاضی اطہر مبارک پوری لکھتے ہیں:

''سید شہاب الدین گردیزی کی اولاد کو مانک پور میں بڑا فروغ ہوا۔امارت و مشیخیت اور دین و دنیا کے امتزاج کی وجہ سے شاہی مناصب اور جاگیرداری نے ان کے قدم چومے۔آگے چل کر روحانیت و مشیخیت نے ان کو مشرقی علاقوں میں حسن قبول بخشا،سلاطین وامراء سے لیکر علماء وفضلاء اور عوام تک ان کے قدرداں بن گئے۔راجہ اور شاہ کے خطابات سے سرفراز ہوئے۔بعد میں اس خاندان کے گوہر شباب چراغ حضرت سید راجہ حامد شاہ چشتی مانک پوری نے جونپور کو اپنی مشیخیت وروحانیت کا مرکز قرار دیکر پورب کو دیار چشت بنادیا اوران کے خانوادے کو اس دیار میں کئی صدیوں تک وہ شان وشوکت حاصل رہی کہ سلاطین شرقیہ،سلاطین لودیہ،سلاطین تیموریہ اور نوابان اودھ کی حکومتوں میں انقلابات آتے رہے،مگر خانوادہ حامدیہ کا مینارہ نور اپنی روشنی دکھاتا رہا۔(دیار پورب علم اور علماء)

اس خاندان کے مشہور بزرگوں میں راجی سید حامد شاہ،راجی سید نور شاہ،راجی سید احمد شاہ،راجی سید محمد شاہ،راجی سید غلام حسین شاہ،راجی سید احمد حلیم اللہ شاہ،راجی سید مردان علی شاہ،راجی سید معین الدین شاہ،راجی سید غلام محی الدین شاہ،راجی سید مصطفی شاہ،راجی سید مبارک شاہ،راجی سید مجتبی شاہ،راجی سید ابراہیم شاہ،راجی سید عبدالحق شاہ اور راجی سید غلام نظام الدین شاہ وغیرہ ہیں۔(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:تذکرہ علمائے پرتاپ گڑھ) شیخ اکرام صاحب نے رود کوثر میں لکھا ہے کہ مسند الہند شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی نانیہالی قرابت اسی خاندان میں تھی۔

طغرل کی بغاوت:

التمش کا پوتا علاء الدین مسعود: ۱۲۴۲ء میں بادشاہ ہوا،تو بنگال کا طاقتور گورنر طغرل خان،مانک پور کڑا پر قبضہ کے ارادہ سے حملہ آور ہوا،تاہم شیخ منہاج نے سمجھایا اور اس طرح قدم اٹھانے سے باز رکھا۔(گزیٹیر)

قتلغ خان کی بغاوت:

علاء الدین مسعود کے بعد التمش کے سب سے چھوٹے بیٹے ولی صفت حاکم

نصیرالدین محمود (۱۲۴۴ء-۱۲۶۵ء) بادشاہ ہوئے۔مسعود کے زمانہ میں نصیرالدین صوبہ بہرائچ کے گورنر تھے،امراء جب علاء الدین مسعود سے تنگ آ گئے تو انھوں نے خاموشی سے نصیرالدین کو بلاکر بیعت کرلی۔نصیرالدین نے قتلغ خان کو اودھ کی جاگیر دے کر رخصت کیا،لیکن بعد میں اودھ سے بہرائچ منتقل کردیا،تو وہ بغاوت پر اتر آیا۔گزیٹیر میں لکھا ہے کہ ۱۲۵۳ء میں ''مانک پورکڑے'' کا گورنر سلطان بلبن کا بھائی الغ مبارک ایبک تھا،اس کا حریف اور مقابل، قتلغ خان تھا،اس نے چاہا کہ مانک پورکواپنی ریاست میں ضم کرلے،تو اودھ کے نئے گورنر ارسلان خان نے اس کوشکست دیدی۔

ارسلان کی بغاوت:

دوسال بعد حاکم اودھ ارسلان خان نے والی مانک پور مسعود جانی کی مدد سے خود علم بغاوت بلند کردیا۔تاہم دہلی سے شاہی فوج کی آمد کی وجہ سے جو غیاث الدین بلبن کی سرکردگی میں آئی، یہ بغاوت فروہوگئی اور بعد کو باغیوں کو معافی بھی مل گئی۔پھر ارسلان خان کو مانک پور کا حاکم بنا گیا،جب کہ مسعود جانی کولکھنوتی (بنگال) کی حکومت تفویض ہوئی۔(پرتاپ گڑھ گزیٹیر:۲۷)

خلجی دورِ حکومت

بلبن کی وصیت کے علی الرغم اس کی وفات کے بعد وزیر سلطنت نے اس وصیت پر عمل نہ کیا اور کیخسرو کے بجائے بغرا خان کے بیٹے کیقباد کے سر پر تاج سلطنت رکھ دیا۔ کیقباد تخت نشینی کے وقت اٹھارہ سالہ نوجوان تھا، اب تک اس کی تربیت بلبن کے زیر اثر بڑے ضابطے اور پابندیوں کے ساتھ ہوئی تھی، تخت نشین ہونے کی بھی اسے کوئی امید نہ تھی، اب جو یکبارگی اس پر سے پابندیاں ہٹیں اور عیش وعشرت وآزادی کے سارے اسباب میسر آئے تو اس نے دل کھول کر داد عیش دینی شروع کی۔ کیقباد کی عیاشیوں سے ایک دو سال ہی کے اندر نظام سلطنت میں خلل آنے لگا۔ بالآخر کثرت شراب اور عیاشی کی بدولت کیقباد لاغر اور ضعیف ہوا، اور جلد ہی مرض فالج میں مبتلا ہو کر حرکت کرنے سے عاجز ہو گیا۔ اس حالت میں چند ترکوں نے جن کے عزیز کیقباد کے ہاتھ مارے گئے تھے، خلجی امراء کے اشارے سے اس کا کام تمام کر دیا۔ ملک جلال الدین فیروز خلجی جو بااثر امیر تھا، اپنے مخالفوں کو راستہ سے ہٹا کر تخت شاہی پر متمکن ہوا۔

جلال الدین خلجی:

سلطان جلال الدین خلجی نے: ۱۳/ جون ۱۲۹۰ء میں سلطنت خلجی کی بنیاد رکھی۔ خاندان غلاماں کے زمانے میں اسلامی حکومت شمالی ہندوستان تک محدود تھی، دکن تک ابھی کوئی مسلمان بادشاہ نہ پہنچا تھا اور گجرات، مالوہ کے راجے خود مختار تھے۔ خلجیوں نے اسلامی حکومت دکن تک پہنچائی۔ اس خاندان کا پہلا بادشاہ جلال الدین خلجی رحم دل، سادہ، اور انتہائی درجے کا متحمل مزاج تھا، نیرنگی روزگار نے اسے عین بڑھاپے میں تخت شاہی پر لا بٹھایا تھا۔ اب تک اس نے جنگ وجدال میں پورا حصہ لیا تھا، لیکن تخت شاہی پر پہنچ کر

اس کی طبیعت میں انقلاب آ گیا۔اورلڑائی بھڑائی سے سخت نفرت ہوگئی۔جب اسے پہلی دفعہ شاہی محل میں لے جایا گیا تو وہ پرانے بادشاہوں کو یاد کر کے بچوں کی طرح رونے لگا۔اس کے زمانہ میں ملک چھجو مانک پور کا گورنر تھا،اس نے بغاوت کی اور گرفتار ہوکر بادشاہ کے سامنے پیش ہوا،تو بادشاہ نے اسے نہ صرف معاف کیا، بلکہ اس کی تعظیم وتوقیر کی اورملتان کے جاگیردار کے پاس یہ حکم دے کر بھیجا کہ ملک چھجوکوایک شاندار محل میں قیام کرائے۔امراء نے اس عمل پر اعتراض کیا تو کہنے لگا تم سہی کہتے ہو،مگر میں نے ستر سال تک کسی مسلمان کا خون نہیں بہایا،اب اخیر عمر میں نہیں چاہتا کہ مسلمانوں کو قتل کراؤں، پھر مجھے یہ بھی خیال ہے کہ میں سلطان بلبن کا نوکر تھا،اس کے مجھ پر بڑے حقوق ہیں،آج میں اس کے تخت پر بیٹھا ہوں،اب اگراس کے عزیزوں کو تہ تیغ کروں تو یہ بڑی بے مروتی ہوگی۔پھر بادشاہ نے اپنے بھتیجے اورداماد علاء الدین کو مانک پور کا حاکم بنا کر روانہ کیا۔اسی قسی القلب بھتیجے نے نمک حرامی کا بدترین مظاہر کرتے ہوئے رحم دل چچا سلطان جلال الدین کوقتل کروادیا۔

علاءالدین خلجی

١٢٩٦ء میں علاء الدین خلجی، چچا کے قتل کے بعد دارالخلافہ میں داخل ہوا،اس نے بیس سال تک حکومت کی۔بقول ابن بطوطہ وہ بہت اچھے بادشاہوں میں شمار کیا جاتا ہے،اوراہل ہنداب (ابن بطوطہ کے زمانہ) تک اس کی تعریف کرتے ہیں۔وہ خودامور حکومت انجام دیتا تھااور ہر روز نرخ وغیرہ کی بابت دریافت کرلیتا تھااورمحتسب سے رپورٹ لیتا تھا۔کہتے ہیں کہ ایک دفعہ اس نے محتسب سے دریافت کیا کہ گوشت گراں ہونے کا سبب کیا ہے،اس نے کہا کہ گائے اوربکری پرمحصول لی جاتی ہے،بادشاہ نے اسی روز سے کل محصول اس قسم کے معاف کرادئے اورسوداگروں کو بلاکرراس المال اور پونجی اپنے خزانہ سے دیااورکہا کہ اس کی گائے اوربکریاں خرید کرلاؤاوران کو بیچ کر قیمت خزانہ میں داخل کرو۔اوراس کی کچھ اجرت مقرر کردی۔اسی طرح سے جو کپڑا دولت آباد سے آتا تھا،اس کا انتظام کیا۔

ایک دفعہ غلہ بہت گراں ہوگیا تو اس نے سرکاری گودام کھلوائے اورنرخ کم ہوگیا۔ باد شاہ نے ایک واجبی نرخ مقرر کردیا کہ اس کے مطابق خرید وفروخت کرو، غلہ بیچنے والوں نے انکار کیا، بادشاہ نے اپنا گودام کھول دیا اوران کو بیچنے کی بالکل ممانعت کردی اور خود چھ مہینے تک بیچتا رہا۔ جب ذخیرہ والوں نے دیکھا کہ اب ان کا غلہ خراب ہوا جاتا ہے اور کیڑا لگ گیا تو انھوں نے بادشاہ سے رجوع کیا۔ بادشاہ نے ایک نرخ مقرر کردیا جو پہلے سے زیادہ سستا تھا اور وہ انہیں منظور کرنا پڑا۔

وہ عید اور جمعہ کے دن سوار ہوکر نہ نکلتا۔ وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس کا ایک بھتیجا تھا، وہ اس سے بہت محبت رکھتا تھا، ایک دن بادشاہ شکار کے لئے نکلا، اس کے ساتھ بھتیجے نے وہی سلوک کیا جو اس نے اپنے چچا کے ساتھ کیا تھا، ایک تیر اس نے مارا جس کی وجہ سے بادشاہ گر گیا، غلام نے اس پر ڈھال ڈال دی، بھتیجا پہونچا کہ اس کا کام تمام کردے تو غلاموں نے کہا کہ وہ مرچکا ہے۔ اس پر اس نے اعتماد کرلیا اور دارالخلافہ کی طرف چل پڑا۔ جب بادشاہ غشی سے ہوش میں آیا تو پورا لشکر اس کے ساتھ ہوگیا، اور علاء الدین نے اس بھتیجے کو قتل کروادیا۔

علاء الدین کا عہد سلطنت تین حصوں میں تقسیم ہوسکتا ہے۔ پہلا دور ابتدائی فتوحات کا زمانہ ہے، جب اس نے منگولوں کو شکست دی اور پٹن گجرات چتوڑ وغیرہ کو فتح کیا۔ دوسرے دور میں اس کی اپنی توجہ اندرونی اصلاحات پر مبذول رہی۔ لیکن ۱۳۰۵ء میں اس نے عین الملک ملتانی کو وسطی ہندوستان کی طرف بھیجا، جہاں اس نے اجین، چاندیری، مانڈور کے قلعوں کو فتح کرکے مالوہ اور وسطی ہندوستان کی خودمختار ریاستوں کو دہلی حکومت کے زیر تخت کیا۔ تیسرے دور میں بادشاہ نے شمالی ہند کے معاملات کو بحسن و خوبی سلجھا کر تسخیر دکن کی تکمیل کی۔

علاء الدین کے جانشین:

سلطان علاء الدین کا انجام بڑا عبرت ناک ہوا۔ مسلسل کامیابیوں کی وجہ سے بادشاہ کا دماغ آسمان پر پہونچ گیا تھا، اب وہ کوئی اختلاف رائے برداشت نہ کرتا، آہستہ آہستہ

اس کی مجلس خیر خواہ اور وفادار مشیروں سے خالی ہوگئی، اس کے علاوہ بادشاہ اپنے سپہ سالار ملک کافور پر اتنا شیدا ہوگیا کہ اس کی ہر بات پر آمَنَّا وَصَدَّ قْنَا کہتا اور ملک کافور نے اس کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔ بادشاہ ان دنوں ایک مہلک بیماری میں مبتلا ہوا، لیکن اس کی بیوی اور ولی عہد خضر خان کو اپنی رنگ رلیوں سے کام تھا، ملکہ جہاں کو اپنے پوتوں کے ختنوں اور عقیقہ کے جشنوں کے سوا کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ ملک کافور نے بادشاہ کو بیوی اور بیٹے کے خلاف بدگمانی میں مبتلا کردیا، چنانچہ اس نے ولی عہد خضر خان اور ملکہ جہاں کو قید کرایا اور اپنے سالے الپ خان کو قتل کرادیا، اس کے بعد باشاہ خود ۱۳۱۶ء میں مرگیا۔

سلطان کی وفات کے بعد ملک کافور نے ایک بادشاہی فرمان دکھایا، جس کے مطابق خضر خاں معزول اور سب سے چھوٹا بیٹا شہاب الدین عمر بادشاہ ہوا۔ پھر خضر خان اور شادی خان کی آنکھوں میں سلائی پھیر کر انہیں اندھا کردیا گیا، یہی حال شہزادہ مبارک کا بھی کرنا چاہا، لیکن عفو وکرم کی درخواست کی بنا پر بچ گیا۔ بعد کو موقعہ پا کر اس نے ملک کافور کی سازشوں کو طشت از بام کیا اور ملک کافور کو ٹھکانے لگایا۔

اب شہزادہ مبارک سلطان قطب الدین کے نام سے تخت نشین ہوا۔ اس کی ابتدا اچھی تھی، لیکن جلد ہی نامبارک اثرات غالب آگئے، جب چند امیروں نے چھوٹے بھائی کو بادشاہ بنا کر بغاوت کا اہتمام کیا تو قطب الدین نے نہ صرف باغیوں اور شہزادوں کو سزا دی، بلکہ اپنے بھائی خضر خان اور شادی خان کو قتل کروادیا۔ جب تخت کے سارے دعویدار ختم ہوگئے تو بری طرح عیاشی اور ہوا پرستی پر کمر باندھ لی۔ اس بادشاہ نے اپنا دین وایمان ایک نیچ ذات کے نومسلم غلام خسرو خان کے ہاتھ میں دے رکھا تھا، اس نے دربار اور محل میں اپنی قوم کے آدمی بھرتی کر لئے اور جب یہ سلسلہ مکمل ہوگیا تو تخت شاہی کی ہوس میں قطب الدین کا خاتمہ کردیا۔ یہ واقعہ ۱۴/اپریل ۱۳۲۰ء کا ہے۔ اس کے بعد خسرو اور اس کے ساتھیوں نے محل سرا میں داخل ہوکر خاندان علائی کے بچے بچے کو قتل کروادیا اور از اول تا آخر اس خاندان کا صفا ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ (آپ کوثر)

عہد خلجی میں پرتاپ گڑھ

باپ بیٹے کا معرکہ:

یہ بات گذر چکی ہے کہ بلبن کا بیٹا ناصر الدین بغرا خان بنگال کا حکمراں تھا، بادشاہ نے مرتے وقت محمد خان شہید کے بیٹے کو بادشاہ بنانے کی وصیت کی تھی، لیکن بادشاہ کا نائب چونکہ خان محمد شہید کے بیٹے کیخسرو سے رنجش رکھتا تھا، اس لئے اس نے ایک حیلہ کر کے ناصر الدین کے بیٹے کیقباد کو بادشاہ بنا دیا اور عام وخاص سب بادشاہ کی بیعت میں داخل ہو گئے۔

ناصر الدین بغرا خان کو اس کی تخت نشینی کی خبر پہونچی تو اس نے کہا کہ حق میرا ہے اور میری زندگی میں میرا بیٹا بادشاہ نہیں ہوسکتا۔ اس نے اپنا لشکر آراستہ کیا اور بڑی جمعیت کے ساتھ دہلی کی طرف بڑھا۔ اس طرف سے نائب نے بادشاہ کو ساتھ لیا اور مانک پور کڑا میں دریائے گنگا کے قریب دونوں لشکر خیمہ زن ہوئے۔ لڑائی شروع ہونے کو تھی کہ اللہ تعالی نے ناصر الدین بغرا خان کے دل میں ڈالا کہ آخر کیقباد تیرا ہی بیٹا ہے اور تیرے بعد وہی باد شاہ ہوگا، لوگوں کی خونریزی سے کیا فائدہ، ادھر بیٹے کے دل میں بھی محبت نے جوش مارا؛ بالآخر باپ اور بیٹے دونوں اپنی اپنی کشتیوں میں بیٹھ کر دریا میں ملے۔ بادشاہ نے اپنے باپ کے قدم چومے اور ناصر الدین نے اسے اٹھا کر کہا کہ میرا جو حق تھا، میں نے تجھے بخش دیا۔

ملک چھجو کی بغاوت:

''ملک چھجو'' بلبن کا بھتیجہ مانک پور کا حاکم تھا، جلال الدین خلجی کے تخت نشین ہونے سے پہلے ہی وہ یہاں حکومت کرتا چلا آرہا تھا، گورنر ہونے سے پہلے اسے شاہی نیابت کی پیش کش ہوئی تھی، مگر اس نے انکار کیا اور مانک پور کی ولایت سے خوش تھا۔ اس سے اندازہ

لگایا جاسکتا ہے کہ اس زمانہ میں مانک پور کا حاکم ہونا، سیاسی اور دفاعی حیثیت کے علاوہ بھی کس قدر معزز اور باوقار منصب تھا۔

اگست/ستمبر ۱۲۹۰ء میں ملک چھجو نے حاکم اودھ حاتم خاں کی طرف سے مدد کی یقین دہانی کے بعد علم بغاوت بلند کر دیا، اس سلسلے میں اسے ملک تاج الدین کوچی، قتلغ خان اور ملک نصرت وغیرہ کی بھی مدد حاصل تھی۔ ملک چھجو نے مغیث الدین کا لقب اختیار کیا اور تاج شاہی سر پر رکھا، اپنے نام سے سکے ڈھلوائے، اور خطبوں میں اس کا نام پڑھا جانے لگا۔ لیکن اس پوری کاروائی کا مقصد چوں کہ سلطنت دہلی کے لشکر پر قابو پانا تھا، جس میں اسے جلال الدین خلجی کے دوسرے بیٹے ارکلی خان کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ اور ملک چھجو گرفتار ہوا، پھر ملتان منتقل کر دیا گیا، تا کہ اس کی حرکتوں پر نظر رکھی جا سکے۔ (گزیٹئر ۱۹۰۸ء)

علاء الدین کا اپنے چچا کو قتل کرنا:

اس واقعہ کے بعد ۱۲۹۱ء میں علاء الدین خلجی مانک پور کا گورنر ہوا، اسی وقت سے اس نے اپنی پوزیشن مستحکم کرنی شروع کر دی، ملک چھجو کے ساتھ بغاوت کرنے والے لوگ، جنہیں جلال الدین نے معاف کر دیا تھا، وہ سب علاء الدین سے آملے۔ ان لوگوں نے علاء الدین کو بہکانا شروع کیا کہ اس علاقہ (مانک پور) کے گورنر کے پاس بڑی فوج ہوتی ہے، اگر وہ کہیں سے وافر مقدار میں مال حاصل کر لے، جس سے خلقت کے دل خریدے جاسکیں تو اس کے لئے دہلی پر قبضہ پانا مشکل نہیں۔ علاء الدین بادشاہ کا داماد تھا، لیکن ساس اور بیوی کی بدسلوکی سے پریشان تھا اور روز کے جھگڑوں سے تنگ آ کر وہ چاہتا تھا کہ ملک چھوڑ کر کہیں چلا جائے، چنانچہ وہ ان مشوروں کا آسانی سے شکار ہو گیا۔

اس نے شہسواروں کا ایک دستہ فراہم کیا اور اسے لیکر وسطی ہندوستان کے دشوار گزار جنگلوں اور پہاڑیوں کو جن کے پار جانے کی ابھی تک کسی مسلمان سپہ سالار کو ہمت نہ ہوئی تھی، عبور کر گیا۔ دکن میں دیوگری (دولت آباد) ایک مستحکم قلعہ تھا، جس میں بے شمار دولت جمع تھی، علاء الدین اور اس کے منچلے ہمراہیوں نے چالاکی اور حسن تدبیر سے اس قلعے پر قبضہ کر لیا اور بے شمار مال و دولت لے کر واپس ہوا۔ مانک پور کڑے پہونچ کر علاء الدین

نے رشتۂ قرابت کی دھجیاں اڑاتے ہوئے مکروفریب سے پیارے چچا جلال الدین کو قتل کروادیا۔

داودخان کا قبول اسلام:

انہیں ایام میں جب کہ علاء الدین خلجی سلطنت دہلی پر قبضہ کے لئے پرتول رہا تھا، تحصیل پٹی ضلع پرتاپ گڑھ کے گاؤں داؤدپور میں بھاروں (پاسی) کا سردار مسلمان ہوگیا (گزیٹئر) اس نے اپنا نام داؤد خان رکھا، بعد میں یہ گاؤں اسی کے نام سے (داؤدپور) موسوم ہوا۔ داؤدخان علاء الدین کا وفادار تھا۔

گورنر ملک یازدہ:

قطب الدین مبارک بن علاء الدین جس کا دورحکومت ۱۳۱۶ء سے ۱۳۲۰ء تک ہے، اس کے زمانہ میں مانک پور علاقہ کا گورنر ملک یازدہ تھے، انھوں نے نومسلم خسرو کی سازش کو بےنقاب کیا تھا، جس کی وجہ سے ان کو اندھا کر کے قید میں ڈال دیا گیا۔ (گزیٹئر)

تغلقی دورحکومت

یہ بات گزرچکی کہ خاندان خلجی کا آخری بادشاہ اپنے نومسلم غلام خسرو کے ہاتھ قتل ہوا، خسرو نے ناصرالدین خسروخان کا لقب اختیارکرلیااورتاج شاہی سر پر رکھا۔اس کا نام اورلقب مسلمانوں کا تھا،لیکن وہ دل سے مسلمان نہ تھااوراپنی قوم کے جن لوگوں کو گجرات سے بلوایا تھا، وہ تو نام کے بھی مسلمان نہ تھے۔انھوں نے مسلمانوں کا جینا حرام کردیا، دربار میں علانیہ بت پرستی ہوتی اور مذہب اسلام کی توہین کی جاتی۔

یہ وقت اسلام کے لئے بڑا نازک تھا۔ہندوستانی مسلمانوں کے لئے یہ ایک ایسانازک وقت تھا، جوانہیں سلطنت دہلی کے آغاز سے اب تک کبھی پیش نہ آیا تھا۔لیکن ایک خدا کا بندہ اٹھا اوراس نے پیشتر اس کے کہ فتنہ جڑ پکڑلے،اس کا قلع قمع کردیا۔یہ ذات تھی غازی ملک فخرالدین ,,جونا,,کی جو بعد میں سلطان غیاث الدین تغلق کے نام سے بادشاہ ہوا۔

غیاث الدین تغلق:

تغلق ایک متدین مسلمان اور خلجی آقاؤں کا وفادار خادم تھا۔خسروخان کی اسلام کش پالیسی اوران مظالم سے جواس غاصب نے خلجی خاندان کے پسماندگان پر توڑے،اسے بڑارنج ہوااوراس نے ظالم کا قلع قمع کرنے پر کمرہمت باندھی۔اس نے اطراف واکناف کے مسلمان رؤسا کو پیغام بھیجے اوران سے مدد چاہی۔بعض نے توذاتی مصلحتوں کوفریضۂ قومی پر مقدم سمجھ کر ساتھ نہ دیا،لیکن دوسروں نے فوجیں بھیجیں، جنہیں ساتھ لیکر غیاث الدین تغلق دارالسلطنت دہلی کی طرف روانہ ہوا۔تھانیسر کے قریب معرکہ ہوا، باوجود

کثرت کے خسرو کی فوج کو شکست ہوئی اور غیاث الدین تغلق دہلی کی طرف بڑھتا رہا۔ دہلی کے باہر دوسری لڑائی ہوئی، سپاہیوں کو لڑائی پر آمادہ کرنے کے لئے خسرو نے خزانے کے دہانے کھول دئے، انہیں تین تین چار چار سال کی تنخواہ پیشگی دی۔ وہ جان توڑ کر لڑے، لیکن غیاث الدین تغلق کی شاندار قیادت کام آئی اور خسرو کو ابتدائی کامیابی کے باوجود شکست فاش ہوئی۔ بادشاہ کے حکم سے خسرو گرفتار کر کے لایا گیا، تو اس نے کہا کہ میں بھوکا ہوں، بادشاہ نے کہا شربت اور کھانا لاؤ، بادشاہ نے اس کو کھانا کھلایا اور پان کھلایا۔ خسرو جب کھا چکا تو اس نے تغلق سے کہا: مجھے رسوا نہ کیجئے، اور میرے ساتھ شاہانہ سلوک کیا جائے۔ تغلق نے کہا بسر وچشم! اور حکم دیا کہ اسی جگہ جہاں اس نے قطب الدین بن علاء الدین کو قتل کیا تھا، وہیں اس کا سر قلم کردو، اور اس کے سر اور نعش کو چھت سے نیچے پھینک دو، جیسا کہ اس نے قطب الدین کو قتل کیا تھا۔ اس کے بعد حکم دیا کہ اس کو غسل دیکر کفن دو اور قطب الدین ہی کے مقبرے میں دفن کردو۔ خسرو کی حکومت پانچ مہینے سے کچھ زائد تھی۔ خسرو کو سزا دینے کے بعد تغلق نے خلجی خاندان کے وارثوں کی تلاش شروع کی اور جب اسے پتہ چلا کہ خسرو نے اس خاندان کا بچہ بچہ قتل کروادیا ہے تو اس نے قتلو خان، جو اس پورے معرکہ میں اس کے شانہ بشانہ تھا، اس سے کہا کہ تو بادشاہ بن جا، مگر قتلو خان نے کہا تم ہی بادشاہ بنو، تو علماء کے اصرار پر خود تخت نشین ہوا۔

یہ بادشاہ تغلق قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا، غریب گھرانے کا چشم و چراغ تھا، لیکن اپنی قابلیت اور فہم وفراست کے بل بوتے ترقی کرتا گیا، یہاں تک کہ فوج کا افسر اعلی ہوا، اسکے بعد مملکت کی سب سے بڑی مہم یعنی منگولوں کی روک تھام سپرد ہوئی۔ تغلق نے چار سال حکومت کی۔ نہایت منصف مزاج اور عالم، فاضل تھا، بالاستقلال بادشاہ بننے کے بعد اسے جو کام کرنا پڑا وہ بیت المال کی درستگی تھی، خسرو نے بلا مبالغہ خزانے پر جھاڑو پھیر دی تھی۔ حکومت کے آخری ایام میں اس بادشاہ کو بنگالہ کا سفر پیش آیا، اس سفر سے واپس آرہا تھا کہ دہلی کے قریب پہنچ کر اس نے ایک لکڑی کے محل میں قیام کیا، جو اس کے بیٹے نے اس موقع پر تیار کروایا تھا، دوسرے روز روانگی سے پہلے کھانا کھا رہا تھا کہ یہ محل جو بہت عجلت میں

تیار ہوا تھا، گر پڑا اور بادشاہ اس کے نیچے دب کر وفات پا گیا۔ غیاث الدین کی موت ہندوستان کے لئے ایک مصیبت عظمی تھی اور سلطان کی وفات کے ساتھ اسلامی حکومت کی انتہائی وسعت کا زمانہ ختم ہوگیا، علاء الدین نے جو علاقے فتح کئے تھے، وہ سلطنت دہلی کے تابع تھے، اور غیاث الدین نے اپنے حسن انتظام سے بنگال اور دکن ہر طرف قابو رکھا تھا، اس کے بعد محمد بن تغلق فرمانروا ہوا، جس کے عہد میں بغاوتیں شروع ہوئیں۔

سلطان محمد بن تغلق:

سلطان غیاث الدین تغلق کی وفات پر ۱۳۲۵ء میں اس لڑکا محمد حکمران ہوا اور ۱۳۵۱ء تک حکومت کرتا رہا۔ یہ بادشاہ مورخین کے لئے ایک معمہ ہے۔ وہ قرآن مجید کا حافظ تھا، نماز روزہ کا بڑا پابند تھا۔ عربی اور فارسی میں بہت اعلی خطوط لکھتا تھا۔ اس کی قابلیت اور جدت طبع سب کے نزدیک مسلم ہے، لیکن اس کے باوجود اس سے ہندوستان کو نقصان زیادہ ہوا اور فائدہ کم۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جو بات اس کے دل میں بیٹھ جاتی تھی، اسے پورا کرنے کے لئے وہ انتہائی شدت سے کام لیتا تھا؛ اس نے دہلی کو چھوڑ کر دولت آباد کو دارالخلافہ بنانا چاہا، کیوں کہ دولت آباد زیادہ مرکزی جگہ تھی اور وہاں سے سارے ملک کا انتظام یقینا آسان تھا، مگر اس ارادے کی تکمیل کے لئے اہل دہلی کو مجبور کیا کہ وہ دور دراز فاصلہ طے کر کے دولت آباد جائیں۔ اسی قسم کے اور کئی احکام اس نے جاری کئے۔ اس کے ناقص منصوبوں سے نہ صرف مخلوق کو تکلیف ہوئی، بلکہ ملک میں عام بدنظمی پھیل گئی اور کئی صوبے دہلی کے اقتدار سے نکل گئے۔ معبر، دھورا سمندر، اور تلنگانہ کا کچھ حصہ تو اس طرح نکلے کہ آئندہ پھر کبھی مسلمانوں سے فتح نہ ہو سکے۔ بہمنی سلطنت اور بنگال کی خودمختار حکومت کا آغاز بھی اسی کے زمانے میں ہوا۔ اور حکومت دہلی کا دائرہ اثر علاء الدین خلجی کے زمانے کی نسبت بہت مختصر ہو گیا۔ (آپ کوثر)

ملا قاسم فرشتہ اپنی تاریخ میں سلطان محمد کی بابت لکھتے ہیں:

سلطان محمد تغلق کی خدمت میں جو مفلوک الحال آتا، مالا مال ہو جاتا۔ بیواؤں، محتاجوں اور ضعیفوں کی خبر گیری اور پرورش کا اس کو خاص خیال رہتا، فارسی اور عربی میں ایسے

مکاتیب لکھتا کہ بڑے بڑے منشی اورادیب حیران رہ جاتے۔فصاحت اورشیریں کلامی میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا،جودت فہم اور جدت ذہن میں خاص طور پر ممتاز تھا۔مردم شناسی کا ملکہ حد کمال کو پہونچا ہوا تھا۔قوت حفظ اس قدر قوی تھا کہ جو ایک مرتبہ سنا؛ساری عمر یاد رہا۔تاریخ،نجوم،فلسفہ،منطق میں دست گاہ کامل رکھتا اورشعر خوب کہتا تھا۔(تاریخ فرشتہ: ۱۴۴/۱،مقالہ دوم،آئینہ حقیقت نما:۵۹۸)

الفسٹن لکھتا ہے:

عالموں،فاضلوں پر ایسی ایسی بخششیں کیں اور ایسے ایسے وظیفے مقرر کئے کہ پہلے کسی بادشاہ نے مقرر نہ کئے تھے۔اس نے طرح طرح کی فیاضی اور دریا دلی سے شفاخانے بنائے اور محتاج خانے جاری کئے،قلمرو کے تمام عالموں،فاضلوں سے ایسے ایسے سلوک کئے کہ اس کے مناقب اور محامد کے چرچے جابجا ہوئے۔تمام لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ یہ بادشاہ اپنے زمانے میں نہایت قابل اور بغایت خوش بیان تھا۔روزہ نماز کا پابند اورشراب نوشی سے نہایت محترز تھا،ذاتی کاموں میں اپنے مذہب کے اصولوں کی پابندی کو مقدم رکھتا تھا۔(تاریخ ہندوستان، چھٹا حصہ،تیسرا باب،ص:۶۶۵)

مشہور عربی سیاح ابن بطوطہ کی آمد:

سلطان محمد بن تغلق کے زمانے میں ہی مشہور سیاح ابن بطوطہ ہندوستان آیا، بادشاہ نے اس کی بڑی قدر کی اور دہلی کا قاضی مقرر کیا۔کچھ عرصے بعد اسے شاہ چین کے پاس اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ابن بطوطہ نے لکھا ہے:

سلطان کو اقامت صلوۃ کا بڑا خیال تھا،تمام ملازموں کو جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا حکم تھا،جو تارک صلوۃ ہوتا،اس کو سخت سزا دی جاتی تھی۔اس نے بازاروں میں آدمی متعین کر رکھے تھے کہ نماز کے وقت جو جماعت میں شریک نہ ہو،اس کو سزا دیں،اس نے حکم دے رکھا تھا کہ آدمیوں کو بلا بلا کر وضو اور نماز کے فرائض بتائیں اورشرائط اسلام سکھائیں،ہر گلی کوچے میں احکام شرعی عوام الناس کو سکھائے جاتے تھے،نماز کے ساتھ دوسرے احکام شرع کی پابندی کے لئے بھی خاص اہتمام سے کام لیتا تھا۔(رحلہ: ذکر

اشتداده فی الصلوة، ماخوذ آئینہ حقیقت نما، ص:۵۹۹)

دوسری جگہ لکھا ہے:

کسی ہندوامیر نے قاضی کے پاس شکایت کی کہ سلطان نے میرے بھائی کو بے سبب قتل کیا ہے، قاضی نے سلطان کی طلبی کا حکم نامہ جاری کیا۔ سلطان قاضی کی مجلس میں حاضر ہوا، اورکوئی ہتھیار قاضی کی مجلس میں نہ لے گیا۔ اس نے قاضی کوسلام کیا اور جب تک قاضی نے بیٹھنے کا حکم نہ دیا کھڑا رہا، قاضی نے فریقین کے بیانات سنے، آخر وہ ہندوامیر اپنے بھائی کے خون بہا پر دلائل سننے کے بعد راضی ہوگیا۔ جب تک قاضی نے جانے کی اجازت نہ دی؛ سلطان قاضی کی مجلس میں ٹھہرا رہا۔(رحلہ:حکایۃ فی تواضع السلطان، ماخوذ آئینہ حقیقت نما، ص:۵۹۹)

ابن بطوطہ آگے لکھتا ہے:

اس بادشاہ کوعربوں کے ساتھ بدرجہ کمال محبت تھی۔ وہ عربوں کوسید کہہ کر پکارتا ہے۔ غیرملکیوں کو بڑے بڑے عہدے دیتا، اس کے بڑے بڑے خواص، دربان، قاضی اوردامادوغیرہ باہری لوگ ہیں، اس کا حکم ہے کہ پردیسیوں کو''عزیز'' کے نام سے پکاریں۔ وہ لکھتا ہے کہ جب میں کالی کٹ پہونچا تو دیکھا کہ وہاں بادشاہ کے چند جہاز (کھڑے) ہیں، جن میں اس نے سیدابوالحسن پردہ دار کو بہت سامال دے کر بھیجا تھا کہ ہرمز اور قطیف میں جاکر جس قدر عرب لاسکے، ہندوستان میں لائے۔(رحلہ:۲/۵۸۱)

امیرسیف الدین اسیرعرب الشام آیا تو ابن تغلق نے اس سے اپنی بہن کا نکاح کیا۔ اسی طرح عباسی خلیفہ جوصحابی رسول حضرت عبداللہ بن عباس کی اولاد میں تھا، اس کو اپنے یہاں بلوایا اورحددرجہ اعزاز واکرام کا معاملہ کیا۔

شیخ شہاب الدین جوصحابی رسول حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے تھے، ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ دہلی میں رہتے تھے۔ دہلی سے چھ میل کے فاصلے پر ایک بڑا بنجر رقبہ ان کو ملا تھا، انھوں نے اس میں زیرزمین گھر، گودام اور حمام وغیرہ بنوائے تھے، اورکھیتی باڑی کی سینچائی دریائے جمنا سے کیا کرتے تھے۔ اس کے زمانہ میں

بیانہ (آگرہ کا قدیم شہر) کا حاکم مجیر بن ابی رجا تھا، جو کہ قریشی النسل عربی تھا۔اس شہر کے عالموں میں امام عزالدین زبیری تھے، جو صحابی رسول حضرت زبیر بن العوام کے خاندان کے تھے۔(رحلہ:۲/ ۵۴۳)

رابڑی شہر کا حاکم بدر حبشی تھا۔ہانسی اور سرسہ کا حاکم سید ابراہیم تھا۔چین کے لئے سفر پر جاتے ہوئے اس نے لکھا کہ ایک معرکہ میں جب میں زخمی ہو گیا، وہاں ایک شخص نے اس کی مدد کی، جس کا بھائی ابوعبداللہ مصری تھا، وہ اٹھا کر مجھے مصری کیمپ میں لے گیا۔(ص: ۲۶۳)اس نے شیخ عریاں جو صرف تہبند میں رہتے تھے، ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ فتنہ تا تار کے زمانے میں عرب سے آ کر یہاں بس گئے تھے۔ایسے ہی جمال الدین مغربی کا تذکرہ کیا ہے جو غرناطہ کے رہنے والے تھے اور ہندوستان میں آ کر بس گئے، اور ان کی اولاد نے یہیں بود و باش اختیار کر لی تھی۔(رحلہ: ۲/ ۶۷۴) ایک بڑی عجیب بات اس نے لکھی ہے:

”واھل تلک البلاد مایدعون العربی الابالتسوید“

ہندوستان کے لوگ عربوں کو ”سید“ کہے بغیر نہیں پکارتے۔(۲/ ۵۲۲)

فیروز شاہ تغلق:

محمد بن تغلق کی وفات کے بعد امراؤ عمائدین نے غیاث الدین تغلق کے بھتیجے فیروز کو تخت دہلی کے لئے منتخب کیا، فیروز کی والدہ نے قبول اسلام کے بعد نکاح کیا تھا۔اس وجہ سے فیروز شاہ کو نانیہالی قرابت کا بھی فائدہ ملا تھا۔اس بادشاہ کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں امن و امان اور رعیت پروری کے لئے یادگار ہے۔اس کا دور حکومت ۱۳۵۱ء سے ۱۳۸۸ء تک اڑتیس سال کو محیط ہے۔سب سے پہلا کام جو اس نے کیا، وہ ان قیدیوں کی رہائی تھی، جنہیں محمد بن تغلق نے جیل خانوں میں ڈال دیا تھا۔جن لوگوں کو اس نے قتل کروا دیا تھا، ان کے پسماندگان کو خون بہا دیا۔اس کے علاوہ پرانے بادشاہوں نے جو دیہات، اراضی یا دوسری جائدادیں ناجائز طور پر ضبط کر کے بادشاہی مقبوضات میں داخل کر لی تھیں، ان کو واپس کیا۔فیروز نے رعایا کی بہبودی کے لئے بہت محنت کی، کئی نہریں کھدائیں، دوسو

سرائیں مسافروں کی سہولت کے لئے بنوائیں، شفاخانے کھولے، جہاں ناداروں کا معالجہ مفت ہوتا تھا، سو کے قریب پل بنوائے۔ کئی شہر آباد کئے۔ جن میں جونپور، فتح آباد اور فیروز آباد مشہور ہیں۔ اس نے سرکاری لگان ادا کرنے میں لوگوں کو سہولتیں دیں۔ اس بادشاہ کے زمانے میں رعیت بہت خوشحال تھی۔ دکن اور بنگال محمد بن تغلق کے زمانے میں خودمختار ہو گئے تھے، فیروز تغلق نے ان علاقوں کو فتح کرنے کی کوئی سرگرم کوشش نہیں کی اور حکومت دہلی میں جو انتشار شروع ہوا تھا، اسے وہ قطعاً نہ روک سکا، یہ اس کی بڑی ناکامی بھی تھی۔ لیکن جو علاقے اس کے قبضے میں تھے، وہاں رعیت کی بہبودی کا بڑا خیال رکھا۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد حکومت میں علم و ادب کو بڑا فروغ ہوا، افسوس کہ اس کی وفات کے بعد حکومت کو زوال آ گیا۔ (آپ کوثر)

تغلقی دور میں پرتاپ گڑھ

(۱) نظام میاں حاکم مانک پور:

سلطان محمد بن تغلق کی سخت پالیسیوں کی سبب اس علاقہ پراس کا بہت برا اثر پڑا۔ چنانچہ ۱۳۳۸ء میں مانک پور کے گورنر نظام میاں نے بادشاہ کے خلاف بغاوت میں حصہ لیا، یہ بغاوت عین الملک کی سرکردگی میں ہوئی تھی۔اس میں عین الملک نے شکست کھائی۔محمد بن تغلق نے اپنی مشہور سختی کے باوجود اسے آسانی سے معاف کردیا تھا اور پھر سے دربار میں معزز جگہ عطا کی۔عین الملک وہی سپہ سالار ہے، کہ غیاث الدین تغلق نے جب خسرو کے خلاف یلغار کی ،تو عین الملک اپنی فوج کے ہمراہ خسرو سے علاحدہ ہوگیا تھا،اوراس کی علاحدگی خسرو کی شکست کا اہم سبب تھی۔

(۲) پرتاپ گڑھ میں قریشیوں کی آمد:

ملتان کے قریشی حکمرانوں کے تذکرہ کے آخر میں شیخ الاسلام بہاء الدین محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کا ذکرخیر آیا تھا۔ان کے پوتے شیخ رکن الدین جو براہ راست شیخ کے خلیفہ تھے،انہیں اپنے زمانے میں بڑاعروج حاصل ہوا۔علاء الدین خلجی آپ کا بڑا معتقد تھا،اس کی زندگی میں آپ دومرتبہ دہلی آئے،بادشاہ نے بڑی عقیدت سے استقبال کیااور رخصت کے وقت کئی لاکھ تنکے (یہ اس زمانہ کی کرنسی تھی) نذر کیئے۔آپ نے وہ رقم مستحقین میں تقسیم کردی۔

ابن بطوطہ نے لکھا ہے: کہ سلطان محمد بن تغلق بھی شیخ رکن الدین قریشی کی بہت تعظیم کرتا تھا۔شیخ رکن الدین کے پوتے شیخ ''ہود'' سے محمد بن تغلق ناراض ہواتو اس نے حاکم

سندھ عماد الملک کو حکم دیا کہ وہ ان لوگوں کی جائداد اور مال ضبط کر لے، عماد الملک نے ان لوگوں کو بلایا، خاندان کے بعض لوگوں کو قتل کیا اور بعض کے ساتھ مار پیٹ کی اور کچھ دنوں تک ہر روز ان سے بیس ہزار دینار وصول کرتا رہا، یہاں تک کہ ان کے پاس کچھ نہ رہا۔ شیخ ''ہود'' نے ترکستان بھاگنے کا ارادہ کیا تو ان کو پکڑ والیا اور کہا: تیرا ارادہ تھا کہ تو ترکستان جائے اور وہاں جا کر کہے کہ میں بہاء الدین زکریا کا بیٹا ہوں، بادشاہ نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے، پھر ترکوں کو (ہمارے خلاف اپنی) مدد پر لائے، پھر ان کے قتل کا حکم دیا اور ان کی گردن ماردی گئی۔ (رحلہ بن بطوطہ: ۲/ ۶۸۴)

نکبت وادبار کے انہیں ایام میں اس خاندان کے کچھ لوگ خاموشی سے الہ آباد موضع بمہرولی میں آ کر بس گئے تھے۔ چنانچہ منبع الانساب میں شیخ اسماعیل قریشی کی آمد کا تذکرہ ہے۔ شیخ اسماعیل کے آنے کی تاریخ گزیٹر الہ باد میں ۱۳۴۹ء درج ہے۔ خیال ہے کہ الہ آباد ہی سے اس خاندان کے کچھ لوگ پرتاپ گڑھ منتقل ہو گئے تھے۔ اور اہل عرب وقریش میں سے گو کہ بہت سے خانوادے اس دیار میں وارد ہوئے مگر قریشی لفظ سے ان لوگوں کا مشہور ہونا،اسی خانوادے کی جانب نسبت کی غمازی کرتا ہے۔ چونکہ قریشی لفظ اس خانوادے کے تعارف کا لازم جزء تھا۔

تفصیل اس کی یہ ہے، جیسا کہ گزیٹیر میں لکھا ہے: ۱۲۵۸ء (یہ تاریخ غلط درج ہے، اصلاً یہ واقعہ ۱۳۴۹ء کے زمانے کا ہے.) میں سوم بنسی راجپوت گھرانے کا ایک 'مکھیا' ''لکھن سنگھ'' الہ آباد سے ''پنچ وسدھ'' میں آباد ہوا۔ اس سے پہلے اس نے بھار (پاسی) اور ''رائیکور چھتری'' لوگوں کو یہاں سے بے دخل کیا، جن کا اس علاقہ پر اقتدار تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ لکھن سنگھ گاؤں ''ہنڈور'' میں آباد ہوا، اس کے بعد اس نے 'ارر' یا 'ارول' علاقہ (پرتاپ گڑھ کا قدیم نام) پر قبضہ کیا۔ (گزیٹیر)

۱۹۰۸ء کے گزیٹر میں بس اتنا ہی لکھا ہے۔ ۱۹۱۱ء والے گزیٹیر میں ''لکھن سنگھ'' کے پرتاب گڑھ آنے کے اسباب وعوامل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے:

Raja baisen was cursed by a Musalman

Faqir,Shekh Taqi,and lost his kingdom.The usual posthumous son was born in exile and with the name of Lakhan sen founded .
(the kingdom of aror.(gazetter:1911AD.page.140

(ترجمہ: (راجہ بئے سنگھ) ایک مسلمان فقیر شیخ تقی کی بدعا سے ہلاک ہوگیا اور اس کی ریاست ختم ہوگئی۔ بئے سنگھ کے مرنے کے بعد اس کے گھر ایک بچے کی پیدائش ہوئی، جس کا نام لکھن سنگھ ہوا، اسی بچے نے ریاست ''ارر'' کی بنیاد رکھی۔)

اگلے صفحہ:۱۴۱ پر مزید تفصیل درج ہے:

Raja Bai sen one day was visited by a Musalman saint Shekh Taqi,who very unreasonably requested him to clear out of the castle and leave it to the saint.The naturally refused,and was not prevailed on by the entreaties of rani,who took part with shekh.The saint of course killedThe Raja,and consoled the rani(who was pregnant)with the assurance that she should have a son of great renown.She went off north-ward as directed by the saint,and arriving at the ancient shrine panchosiddh near the town of partabgarh,gave birth to a son,Lakhans sen. (gazetter:1911AD.p.141)

(ترجمہ: راجہ ''بئے سنگھ'' کے پاس ایک دن مسلمان بزرگ شیخ تقی آئے اور انھوں نے راجہ کے سامنے یہ غیر منطقی مطالبہ رکھا کہ وہ قلعہ سے دستبردار ہوجائے اور قلعہ اس کے لئے چھوڑ دے۔ راجہ نے اس سے انکار کیا اور اس سلسلے میں رانی جو کہ شیخ تقی کی طرف

داری کررہی تھی، اس کی بھی التجا ٹھکرادی۔ شیخ نے تب راجہ کو قتل کردیا اور رانی کو جو کہ اس وقت حمل سے تھی، اسے مشورہ دیا اور یہ یقین دہانی کرائی کہ اس کے پیٹ سے ایک نامور لڑکا پیدا ہوگا، چنانچہ رانی شیخ کے مشورہ کے مطابق جانب شمال روانہ ہوئی اور شہر پرتاب گڑھ کے قریب ''پنچوسدھ'' نامی جگہ پہنچ کر ایک لڑکے ''لکھن سنگھ'' کو جنم دیا۔

اس جگہ شیخ تقی نیز مذکورہ بالا واقعہ کے بارے میں دیگر تاریخی کتابوں سے اصل حقیقت جاننا ضروری ہے۔ شیخ تقی کی بابت صاحب نزہۃ الخواطر منبع الانساب کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

الشیخ الصالح علی بن علی بن محمد الحسینی البھکری الشیخ تقی الدین الجھونسوی احد کبار المشائخ السھروردیہ ولد بجھونسی سنة عشرین وسبع مئة۔ثم سافر الی البلاد واخذ عن الشیخ علاء الدین الحسینی الجیوری ولازمه زماناً،ثم رجع وتصدر للارشاد اخذ عنه خلق کثیر۔توفی سنة خمس وثمانین وسبع مئة کمافی منبع الانسباب۔

ترجمہ: شیخ صالح تقی الدین علی بن علی بن محمد حسینی جھونسوی بھکری سہروردیہ سلسلے کے بڑے مشائخ میں سے ہیں۔ ۷۲۰ھ میں ان کی پیدائش جھونسی (الہ آباد) میں ہوئی۔ حصول علم کے لئے انھوں مختلف مما لک کا سفر کیا، پھر شیخ علاء الدین حسینی سے خصوصی استفادہ کیا اور ایک زمانہ تک ان کی خدمت میں رہے۔ پھر مخلوق کی اصلاح وتربیت میں مشغول ہوئے۔ وفات ان کی ۷۸۵ھ میں ہوئی۔ جیسا کہ منبع الانساب میں تحریر ہے۔ (نزہۃ الخواطر ۲/ ۱۸۰)

تاریخ مشائخ الہ آباد میں لکھا ہے کہ کبیر داس شیخ تقی کے معتقدین میں سے تھا، اس نے شیخ تقی کے تعلق سے یہ دوہا کہا ہے:

گھٹ گھٹ میں ابناشی سنو تقی تم شیخ
مانک پور میں کبیر بسے رے
مدحت سن شیخ تقی کی رے

او جی سنی جونپور تھا نا
جھونسی سنی پیرن کے ناما

اصل بات یہ ہے کہ گزیٹیر میں جس واقعہ کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، وہ شیخ تقی کا نہیں، بلکہ ان کے والد شیخ مرتضی کا ہے، جن کا نام علی بن محمد حسینی بھکری جھونسوی ہے۔ صاحب نزہۃ الخواطر ان کی بابت لکھتے ہیں: سید مرتضی کا لقب شعبان الملت ہے، پیدائش ان کی ۶۳۰ھ میں ملتان شہر میں ہوئی، انھوں نے شیخ شمس الدین حسینی عریضی اور شیخ رکن الدین ملتانی سے ایک زمانہ تک اکتساب فیض کیا، اس کے بعد بہار تشریف لے گئے، اور وہاں شیخ منہاج الدین حسن بہاری کی پاس بارہ سال مقیم رہے۔ شیخ منہاج شیخ نجم الدین کے شاگرد تھے، جو شیخ رکن الدین ملتانی کے متوسلین میں سے تھے۔ شیخ مرتضی جب مشیخیت کے رتبہ کو پہنچ گئے، تو شیخ منہاج نے انہیں شیخ پورہ بھیجا، چنانچہ وہ وہاں رہے، پھر حکم دیا کہ اب (تبلیغ اسلام کے لئے) پریاگ الہ آباد جاؤ۔ چنانچہ وہ الہ باد گئے اور وہاں پہونچ کر آپ نے گنگا پار سنگم کے قریب ''ہر بونگ پور'' کے پاس جنگل میں قیام کیا۔ ان کے ہاتھ پر بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا، وفات ان کی ۷۶۰ھ (۱۳۵۸ء) میں ہوئی۔ (نزہۃ الخواطر: ۱۸۰/ ۲)

راجہ ہئے سنگھ کا واقعہ جس کے بارے میں گزیٹر میں لکھا ہے کہ شیخ تقی نے اس کو قتل کر دیا اور محل پر قبضہ کرلیا۔ اس واقعہ کی اصل حقیقت منبع الانساب میں اس طرح لکھی ہے: شیخ مرتضی شیخ پورہ میں مقیم تھے تو شیخ منہاج نے آپ کو اپنے پاس بلایا اور فرمایا: آج رات میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا، آپ فرما رہے تھے کہ مرتضی کو یہاں سے کفرستان پیاگ (پریاگ الہ آباد) بھیجو، تا کہ وہ وہاں جا کر رسم اسلام جاری کرے۔ مرشد کے حکم پر وہ پریاگ کے لئے روانہ ہوئے، پچاس خدا رسیدہ درویش وفقراء بھی شیخ منہاج کی خانقاہ سے آپ کے ساتھ ہوگئے۔ یہ جماعت جب جھونسی پہنچی تو اس وقت اس جگہ کا نام ''ہر بونگ پور'' تھا۔ جھونسی سے دکھن جانب بہت بڑا جنگل تھا۔ ان حضرات نے اسی جنگل میں پہنچ کر گنگا کے کنارے قیام فرمایا۔ ان لوگوں نے اذان دی، ''ہر بونگپور'' کے غیر مسلم راجہ نے کہا کہ یہ ''ملیچھ'' کہاں سے آگئے ہیں؟ جو ہمارے علاقے میں آکر اذان

دے رہے ہیں، اس نے اپنے آدمیوں کو بھیجا کہ جا کران لوگوں سے کہدو! کہ تم لوگ مسلمان ہو، یہ علاقہ ہندوؤں کا ہے، اس لئے یہاں سے چلے جاؤ، کیوں کہ یہاں تمہارا ٹھہرنا اچھا نہیں ہے۔ شیخ مرتضی نے کہا: میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اپنے پیر کے حکم سے یہاں آ کر ٹھہرا ہوں۔ تمہارے بلانے سے نہیں آیا۔ ہمیں اس جگہ رسم اسلام جاری کرنی ہے۔ واپس نہیں جانا ہے۔ تو اس راجہ نے اپنے نوکروں کو بھیجا، کہ شیخ اور ان کے رفیقوں کا سر کاٹ کر دریا میں ڈال دیں۔ راجہ کے یہ نوکر حضرت شیخ مرتضی کو ڈھونڈھنے نکلنے۔ جب نزدیک پہونچے تو تلواریں کھینچ لیں اور چاہا کہ قتل کر دیں۔ کچھ دیر بعد راجہ خود بھی آ گیا اور اس نے شیخ مرتضی کے سات درویش ساتھیوں کو شہید کر دیا۔ اس وقت شیخ نے اس راجہ کے لئے بددعا کی اور انگشت شہادت سے آسمان کی طرف اشارہ کیا، پس سارے دشمنوں کا سر یکبارگی تن سے جدا ہو گیا۔ اور قلعہ تباہ و برباد ہو گیا، عمارتیں تہہ و بالا ہو گئیں۔ اس واقعہ کو دیکھ کر علاقہ کے ہندو مسلمان بن گئے۔ (منبع الانساب ص: ۳۴۰) واقعہ کی اصل حقیقت یہ ہے، جسے گزیٹئر تیار کرنے والے مرتبین نے غلط انداز سے تحریر کیا ہے۔

سادات بھکر کا یہ خاندان مخدوم بہاء الدین زکریا ملتانی کے متوسلین کا ہے، سمجھا جاتا ہے کہ مصیبت کے اوقات میں اسی تعلق کی بنا پر شیخ ملتانی کے اہل وعیال میں سے کچھ لوگ یہاں ان کے پاس الہ آباد آئے اور موضع بمہرولی میں آباد ہو گئے، چنانچہ شیخ اسماعیل قریشی جو شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے خاندان سے تھے، ان کا مزار آج بھی بمہرولی میں موجود ہے۔ شیخ مرتضی صاحب شیخ اسماعیل قریشی کا بہت زیادہ احترام کیا کرتے تھے، دونوں بزرگوں کے مابین بڑی محبت تھی۔ منبع الانساب میں لکھا ہے: کہ اس واقعہ کے پانچ سال بعد مخدوم محمد اسماعیل کے اصرار پر شیخ مرتضی نے شاہ غالب سوار جن کی درگاہ موربہ (پرگنہ لکھر، الہ باد) میں ہے؛ اس گھرانے میں شادی کی۔ شاہ غالب سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، شیخ مرتضی کی چار اولادیں ہوئیں، دو صاحب زادے اور دو صاحب زادیاں۔ ایک صاحب زادے علی عامر جنہیں عمر شہید کہتے ہیں، وہ جہاد میں شہید ہو گئے تھے اور دوسرے صاحب زادے مخدوم سید شاہ تقی الدین ہیں۔ شاہ

تقی کے چھوٹے صاحب زادے کا نام بھی محمد تقی تھا، لقب شاہ عثمان اکبر،ان کی شادی شیخ شہاب الدین بن مخدوم شیخ اسماعیل قریشی کے خاندان میں ہوئی۔(منبع الانساب: ۲۳۳)

سوم بنشی راجا ''بیئے سنگھ'' کی ریاست اور لاؤ لشکر جب سب کچھ تباہ و برباد ہوگیا، توان کی حاملہ بیوی شیخ تقی کے حکم سے پرتاپ گڑھ کے گاؤں (ایک روایت کے مطابق) ہنڈور(اوردوسری روایت کے مطابق پنچوسدھ) میں آکرآباد ہوگئی۔ جہاں بچے کی ولادت ہوئی اوراس کا نام لکھن سنگھ رکھا گیا۔اسی بچے نے علاقہ سے بھار(پاسیوں) کوشکست دے کر پورے علاقہ پرقبضہ کرلیااورریاست ''ارر'' کی بنیادرکھی۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ لکھن سنگھ کو علاقہ کے بھارحکمرانوں کوشکست دیکر بھگانے کی ضرورت کیوں پیش آئی اورایک اجنبی علاقہ میں بیوہ ماں اوریتیم بیٹے کے لئے یہ کیوں کرممکن ہوا کہ علاقہ کے حکمرانوں کوشکست دیں اوران کی جائداد پرقبضہ کرلیں؟اسی سوال کے جواب میں پرتاپ گڑھ کی قریشی برادری کی آمد کاراز پوشیدہ ہے۔

اصل بات یہ ہے جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہاں بھروں کی حکومت تھی، بھروں کا سردار اکثر وبیشتر یہاں سیروشکار کے لئے آیا کرتا تھا، جب لڑکا ذرابڑا ہواتو بھروں کے سردار کی نظراس بچے پر بڑی،تو اسے اس کے اندرسرداری کے آثارنظرآئے، پنڈتوں نے بھی اس بات کی تصدیق کی تو بھروں کے سردار نے اس بچے کوقتل کرنے کا ارادہ کرلیا اوراس کے لئے حیلے بہانے شروع کئے۔ ماں جب صورت حال کی نزاکت سے واقف ہوئی تواس نے بچے کو یہاں سے ہٹادیااوربعدمیں فوجی لشکرکی مدد سے یہاں کے بھاروں کو سبق سکھایا۔منشی رحم علی صاحب لکھتے ہیں: کہاجاتا ہے کہ یہی فوجی لشکرجن کے ساتھ عورتیں بھی تھیں، یہاں آباد ہوگئے، پرتاپ گڑھ کے قریشی مسلمانوں میں ان کی کافی تعدادموجود ہے۔انہیں میں ایک مشہور بزرگ بھی تھے جن کا نام حرمت علی شاہ تھا، جوسئی ندی کے کنارے مقیم ہوگئے تھے،اورآج تک تکیہ حرمت علی شاہ مشہور ہے۔(تذکرۃ القریش والافغان،ص ۷۸)

عوام میں تیحی پور کے تعلق سے بھی اس طرح کی باتیں مشہورہیں کہ یہاں چار بھائی

آئے تھے، جن میں سے ایک کا نام شیخ یحیی تھا۔ یہ لوگ بحیثیت مسلمان باہر سے آ کر یہاں آباد ہوئے تھے شاید اسی وجہ سے قریشیوں کی بستیوں کو اہل وطن مُسُر منوٹی (یعنی مسلمانوں کی بستی) کے نام سے یاد کرتے، جبکہ دیگر برادریوں کی بستیوں کو انہیں برادریوں کے ناموں سے پکارتے ہیں۔

یہ فوجی لشکر کہاں سے آیا تھا۔ سوچنے کی بات ہے کہ ایک لاچار و بے کس بیوہ عورت جو شیخ تقی کی معتقد تھی اور انہیں کے مشورہ پر ایک انجان علاقے میں محض اس امید پر آبسی تھی، کہ اس کے پیٹ سے ایک نامور لڑکا پیدا ہوگا۔ پیدائش و پرورش کے ایک زمانہ بعد جب اس عورت کو بچے کی ہلاکت سامنے نظر آئی ہوگی، تو اس وقت مدد کے لئے اس نے کس کو پکارا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ وہ شیخ تقی کے پاس ہی گئی ہوگی، جن کے والد شیخ مرتضی کے حکم سے وہ یہاں آ کر آباد ہوئی تھی۔ پھر ''الہ باد'' کچھ دور بھی نہ تھا کہ اس کے لئے طویل سفر کی ضرورت ہوتی۔ لامحالہ شیخ تقی کے پاس ہی گئی ہوگی، اور شیخ تقی نیز شیخ اسماعیل اور ان کے خانوادہ کے لوگ جو حکومت مانک پور کے اہم فوجی سرداروں میں تھے، اس سلسلے میں ضرور اس کی مدد بھی کی ہوگی، بمرولی الہ آباد اور اس کے قرب و جوار میں آباد لوگوں میں قدیم زمانے سے پرتاپ گڑھی قریشیوں کی رشتہ داریاں اور قرابتیں، اسی بات کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔ نیز ''ملک سنگھ'' جو اس عورت کا پوتا تھا، اور بعد کو مسلمان ہو گیا تھا، اس نے بھی مسلمان ہونے کے بعد ''الہ آباد'' کا ہی رخ کیا تھا۔ گزیٹر میں لکھا ہے:

one of his sons(baisen) was a convert to islam

ترجمہ: بیر سنگھ کا ایک لڑکا مسلمان ہو گیا تھا۔ (جس کا نام ملکھ سنگھ تھا)

آگے مزید لکھتا ہے:

He was appointed Subahdar of allahabad and married a princess of the imperial family. Thence he invaded his brother,s dominions and expelling the chief desired to convert the whole clan of

sombansis to the muhammadan faith.

(ADgazetteer 1911)

(ترجمہ:اس (ملکھ سنگھ) کو''الہ آباذ'' کا گورنر بنادیا گیااور شاہی خاندان کی ایک شہزادی سے اس کی شادی بھی کردی گئی۔تو ملکھ سنگھ اپنے بھائیوں کی جائداد پر حملہ آور ہوا،اوراس نے اپنی اصلی خواہش کا اظہار کیا کہ پورا سوم بنشی خاندان مذہب اسلام قبول کرلے۔)

یہ فوجی لشکر چوں کہ راجپوتوں کی مدد کے لئے یہاں آکر آباد ہوا تھا،اس لئے حکومت وقت کی طرف سے انہیں ڈائریکٹ کوئی زمین الاٹ نہیں ہوئی، بلکہ قبضہ کے بعد سوم بنشی راجاؤں کی طرف سے انہیں زمینیں ملیں۔چنانچہ قریشی برادری کے لوگ اکثر انہیں علاقوں میں پائے جاتے ہیں، جہاں کسی نہ کسی زمانہ میں اس خاندان کے لوگ بحیثیت راجہ تھے۔ شروع میں یہ خاندان ہنڈور میں رہا، پھر گونڈے، چلبلا، پرتھی گنج، تیج گڑھ،ڈومی پور،بیس پور،نور پور، بہلول پور،سہودر پور وغیرہ میں رہا اور یہی وہ علاقے ہیں جہاں قریشیوں کی اصل آبادی ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ یہ لوگ''الہ آباذ'' سے آئے تھے۔اور قریشیوں کا آج تک بمرولی کے علاقہ میں رشتہ داریاں اس کا بین ثبوت ہیں، ورنہ غیر قریشیوں میں شادی بیاہ کا مزاج و مذاق اس برادری میں کبھی نہیں رہا ہے۔ہاں دینی مزاج وسماجی مذاق میں تھواڑا سا فرق اس وجہ سے ہوسکتا ہے کی پرتاپ گڑھ والوں کوسید امین نصیر آبادی اوران کے متبعین علماء کی دینی رہنمائی حاصل رہی، جبکہ اہل بمہرولی اس سے تہی دست رہے۔البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ لشکر میں سبھی لوگ قریشی نہیں تھے، بلکہ بعض ان میں افغان تھے تو بعض ترک بھی تھے۔ اسی طرح بعد کو وہ راجپوت بھی اس برادری میں شامل ہوگئے،جنھوں نے ان کے ہاتھ اسلام قبول کیا۔قریشیوں نے ان کے ساتھ رشتہ قرابت استوار کیا اوران کو اپنے اندر اس طرح جذب کرلیا کہ وہ سب آپس میں مل کر ایک قوم اور خاندان ہوگئے۔انہیں قریشیوں میں وہ لوگ بھی ضم ہوگئے جن کی بابت واجب الارض میں لکھا ہے کہ وہ محمود غزنوی کے زمانہ

میں یہاں آئے تھے۔

ہر چند کہ قریشی قوم بھی مرورِ زمانہ کے ساتھ ہندستانی تہذیب وتمدن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی، مگر شرک وبدعت کو اس قوم میں کبھی فروغ نہیں ہوا۔ مجموعی طور پر اس قوم کو شرک وبدعت سے فطری اور طبعی نفرت ہے۔ شجاعت، بہادری، دلیری، فیاضی، وفاداری اور مہمان نوازی جیسی صفات ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہیں۔ آج بھی ان کا یہ حال ہے کہ کسی حاجت مند کی امداد اور تعاون میں کسر نہیں اٹھار کھتے۔ مہمان نواز اتنے کہ چاہے قرض لینا پڑے مگر مہمانی میں فرق نہیں آسکتا۔ اپنی عزت اور خودداری کے لئے اپنی جان کی پرواہ نہیں کرتے۔ وفاداری وحق گوئی ان کا خصوصی امتیاز ہے۔ گھوڑسواری اور صحراء نہ ہونے کے باوجود اونٹ رکھنے کا شوق آج بھی ان کے اندر ہے۔ ان کی چمکدار پیشانیاں اور پرشوکت داڑھیاں ان کی نیک سیرتی کی گواہی دیتی ہیں۔ نہایت سادہ غذا کھاتے ہیں اور سادہ زندگی گزارنا بھی پسند کرتے ہیں۔ شہری بود باش کے مقابلے میں دیہاتی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔ جفاکشی ومحنت طبیعت میں ہے، مانگ کر کھانے کا تصور بھی نہیں۔ ان کی آپسی بول چال میں بعض عربی الفاظ مثلاً: قدحا (پیالہ) , کوبت کم کرنا (سزادینا، عقوبۃ سے) دوانری (دار، یدور، دوران سے) وغیرہ اب بھی پائے جاتے ہیں، معمولی غور کرنے سے ماہر زبان کے لیے ان کی تعیین مشکل نہیں۔

(نوٹ) واضح رہے کہ اس زمانہ میں ہندو پاک میں مقیم قصاب برادری کے لوگ بھی اپنے آپ کو قریشی لکھتے اور کہتے ہیں، پرتاپ گڑھ میں آباد خاندان قریش کا نسلی اور خاندانی طور پر ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ ہی کبھی ان سے آپس میں رشتہ داری رہی ہے۔ بلکہ ان کا تعلق جیسا کہ مذکور ہو چکا قریش عرب سے ہے۔ اس مقام پر راقم الحروف پرتاپ گڑھ کے قریشیوں کو مشورہ دے گا کہ اس التباس سے بچنے کے لئے بہتر ہے کہ یہ اپنے تئیں قریشی لکھنے کے بجائے "قَرشی" لکھا کریں۔ اس سے لوگوں کو امتیاز میں آسانی ہوگی۔

(۳) پارچہ بافی کی صنعت:

قاضی اطہر مبارک پوری رقم طراز ہیں:

(تغلقی دور میں) خاص طور سے پارچہ بافی صنعت نے یہاں (مانک پور میں) بڑی ترقی کی۔ مشہور مغربی سیاح ابن بطوطہ نے آٹھویں صدی میں کڑا مانک پور اور اس کے ماتحت علاقوں کے بارے میں لکھا ہے:

وتصنع بها الثياب الرفيعه، ومنها تجلب الى دهلى وبينهما مسيرة ثمانية عشر يوما۔ (رحلة ابن بطوطه: ۲۵۲)

(ترجمہ: ان علاقوں (مانک پور) میں نہایت عمدہ قسم کے کپڑے تیار کئے جاتے ہیں اور یہاں سے دہلی بھیجے جاتے ہیں، جس کی مسافت یہاں سے اٹھارہ دن کی ہے۔) جونپور، مئو، اعظم گڈھ، بنارس میں پارچہ بافی کی صنعت اسی علاقہ سے حاصل کردہ ہے۔ (دیار پورب علم اور علماء)

(۴) راجپوت کو "راہبردار" کا خطاب:

گزیٹر میں لکھا ہے کہ فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں سوبنشی خاندان کے راجہ "سلطان شاہ" نے "رہبردار" کا خطاب حاصل کیا۔ اس راجہ نے بندیل کھنڈ علاقہ کے باغیوں کو زیر کر کے، انہیں حکومت کی ماتحتی پر مجبور کیا، اس کے عوض اسے "راہبردار" کے خطاب سے نوازا گیا۔

(۵) مردان دولت حاکم مانک پور:

فیروز شاہ تغلق نے ۱۳۷۷ء میں اس علاقہ کا حاکم ناصرالملک مردان دولت کو بنایا۔ ایک سال بعد اس کے بیٹے شمس الدین سلیمان نے اس کی جگہ لی۔ شمس الدین؛ فیروز شاہ تغلق کے بعد برپا ہونے والی خانہ جنگی کے زمانہ تک یہاں کا گورنر رہا۔ (گزیٹر)

(۶) مانک پور میں مخدوم جہانیان جہاں گشت کی آمد:

بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۳۷۹ء میں مشہور بزرگ سید جلال الدین مخدوم جہانیان جہاں گشت رحمۃ اللہ علیہ مانک پور تشریف فرما ہوئے تھے۔ آپ سید جلال الدین منیر شاہ بخاری کے پوتے اور سید صدرالدین مشہور بہ راجو قتال کے حقیقی بھائی تھے۔ آپ نے شیخ

صدر الدین کے علاوہ شیخ رکن الدین جو شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے لڑکے اور جانشین تھے، ان کے پاس علوم ظاہری و باطنی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ مشہور ہے کہ آپ کو چودہ خانوادوں میں بیعت کی اجازت حاصل تھی۔ آپ نے ہندوستان کے علاوہ عرب، مصر، شام، عراق، بلخ و بخارا کی سیر کی اور چھتیس حج کئے۔ آپ کے ہاتھ پنجاب، گجرات اور دیگر علاقوں کے بہت سے قبائل مشرف باسلام ہوئے تھے۔ ۱۳۶۴ء میں آپ کی وفات ۷۷/سال کی عمر میں ہوئی۔ سلطان محمد بن تغلق آپ کا بڑا معتقد تھا، فیروز شاہ تغلق حد درجہ آپ کا اعزاز و اکرام کیا کرتا تھا۔ گزیٹر میں لکھا ہے کہ آپ کی آمد مانک پور کے دامغانی محلے میں اس غرض سے ہوئی تھی کہ آپ عید الفطر کی نماز پڑھائیں۔ تاہم کسی وجہ سے شیخ ناراض ہو گئے۔ چنانچہ ''گردیزی'' محلے میں گئے، جہاں شیخ شہاب الدین گردیزی کے وارثوں (سید عزیز الدین اور سید شرف الدین وغیرہ) نے خوش آمدید کہا، اس موقع پر شیخ بہت خوش تھے اور کہا جاتا ہے کہ اسی مناسبت سے اس خاندان کو اولاً ''راجی'' اور بعد میں ''قاضی'' کا خطاب ملا۔ (گزیٹر)

طوائف الملوکی، لودہی اور سوری دور حکومت

فیروز شاہ تغلق کی وفات ۱۳۸۸ء میں ہوئی، اس کے بعد تخت کے کئی دعویداروں میں خانہ جنگی ہوئی، جو بادشاہ فیروز کے جانشین ہوئے، وہ بڑی ذمہ داریوں کے اہل نہ تھے، چنانچہ حکومت دہلی کا اقتدار بہت کم ہو گیا اور رہا سہا اقتدار تیمور کے حملے نے مٹا دیا جو ۱۳۹۸ء میں افغانستان کے راستے ہندوستان آیا۔ راستے میں جہاں کہیں سے وہ گزرا، قہر الٰہی کی طرح علاقوں کو تاخت و تاراج اور باشندوں کو قتل کرتا آیا۔ دہلی میں محمود تغلق بادشاہ تھا، وہ دہلی چھوڑ کر گجرات فرار ہو گیا۔ تیمور نے شہر کو لوٹا اور باشندوں کا قتل عام کیا، پھر میرٹھ اور جموں کے راستے واپس گیا اور عیسائی قیصر کی درخواست پر اس نے سلطان بایزید یلدرم سے لڑائی کی تیاری شروع کی اور بالآخر اس نے سلطان بایزید یلدرم کو شکست فاش دے کر یورپ کو ایک عرصے کے لئے عثمانی ترکوں سے محفوظ کر دیا۔ ''تیمور'' ہلاکو خان اور چنگیز خاں کا جانشین تھا۔ اگرچہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتا تھا، لیکن اس پر اور اس کے ساتھیوں پر اسلامی تعلیمات کا ابھی وہ اثر نہ ہوا تھا، جو آہستہ آہستہ بابر اور بعد کے مغلوں پر ہوا۔ بلکہ ابھی تک اس میں اپنی نسل کی روایتی سخت گیری اور درشت مزاجی بہت حد تک باقی تھی، لیکن یہ صحیح ہے کہ وہ ہلاکو خان اور چنگیز خان سے کہیں بہتر تھا اور گاہے گاہے وہ مسلمان اولیاء کی سفارش پر کسی قدر رحم سے کام لیتا تھا۔

جب تیمور چلا گیا تو محمود تغلق واپس آیا اور تخت دہلی پر قابض ہو گیا۔ لیکن تیمور نے دہلی کو ایک بے جان جسم کی طرح چھوڑا تھا اور اب دہلی کے بادشاہ میں اتنی سکت نہ رہی تھی کہ وہ باہر کے صوبیداروں سے اپنا حکم منوا سکے۔ چنانچہ اب وہ فقط دہلی اور اس کے گرد و نواح کا

صوبیدار تھا اور باقی تمام وسیع صوبوں پر خودمختار حکمران قابض تھے۔

بنگال:

بنگال محمد بن تغلق کے زمانے میں خودمختار ہوگیا تھا، اور ۱۵۳۸ء شیر شاہ سوری کے زمانے تک خودمختار رہا۔ بنگال کے خودمختار بادشاہوں میں سب سے زیادہ بااقتدار بادشاہ علاء الدین حسین شاہ تھا۔ جس نے آسام کا بہت سا حصہ فتح کرلیا اور پچیس سال تک بڑی شان وشوکت سے حکومت کی۔

بہمنی حکومت دکن:

۱۳۴۷ء میں بہمنی حکومت کی بنیاد علاء الدین بہمن شاہ کے ہاتھ پڑی۔ گلبرگہ و بیدر اس کے دارالخلافے تھے۔ تقریباً ۱۳۵ سال تک یہ حکومت بڑی شان وشوکت سے قائم رہی۔ اس کے بعد اس کا وسیع علاقہ پانچ مختلف خاندانوں میں تقسیم ہوگیا۔ (۱) بیجاپور میں عادل شاہی حکمراں تھے۔ (۲) احمد نگر میں نظام شاہی۔ (۳) برار میں عماد شاہی۔ (۴) بیدر میں برید شاہی۔ (۵) اور گولکنڈہ میں قطب شاہی۔ برار ۱۵۷۸ء میں نظام شاہی حاکموں کے قبضے میں آگیا۔ ۱۶۰۹ء میں بیدر کی خودمختاری کا خاتمہ ہوا۔ احمد نگر شاہجہاں کے زمانے میں مغلیہ سلطنت کا جزء ہوگیا اور ۱۶۸۷ء میں گولکنڈہ اور بیجاپور اورنگ زیب نے فتح کرلئے۔ یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ دہلی کے حکمراں اخیر تک سنی رہے اور شاہان لکھنو سے پہلے شمالی ہندوستان میں شیعہ مذہب کے فروغ کی کوئی سیاسی کوشش نہیں ہوئی تھی، دکن کا معاملہ اس کے برخلاف تھا، بیجاپور، گولکنڈہ اور احمد نگر کے اکثر بادشاہ شیعہ تھے۔

جونپور میں شرقی حکومت:

۷۹۶ھ مطابق ۱۳۹۴ء میں دہلی حکومت نے خواجہ جہاں ملک سرور کو سلطان الشرق کا خطاب دیکر جون پور کی امارت دی۔ مگر بعد میں اس نے سلطان الشرق کا لقب اختیار کرکے جونپور میں خودمختار شرقی سلطنت کی بنیاد رکھ دی۔ یہ سلطنت ۱۴۷۶ء تک خودمختار رہی، جس میں چھ سلاطین ہوئے۔ (۱) خواجہ جہاں ملک سرور (۲) مبارک شاہ شرقی

(۳)ابراہیم شاہ شرقی (۴)محمود شاہ شرقی (۵)محمد شاہ شرقی (۶)حسین شاہ شرقی۔ اس عرصے میں جونپور نے بڑی ترقی کی اور علم وفضل کا مرکز بن گیا۔جس طرح اٹھارویں صدی میں دہلی کے شعراء کی جائے پناہ لکھنو تھا،اسی طرح چودھویں صدی میں جولوگ تیمور کی تباہ کاریوں سے بچنا چاہتے تھے،ان کے لئے ماوی وملجا جونپور تھا۔ چنانچہ ابراہیم شرقی کے زمانے میں جونپور کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ابراہیم کے دربار میں سب سے زبردست عالم قاضی شہاب الدین دولت آبادی تھے۔

مالوہ:

بنگال،دکن اور جونپور کے علاوہ تیسری خودمختار سلطنت مالوہ کی تھی،جس کی یادگار مانڈوشادی آباد کی عظیم الشان عمارتیں ہیں۔ یہ حکومت بہت وسیع نہ تھی، بالآخر یہ والی گجرات کے قبضے میں آگئی۔

گجرات:

شاہان گجرات میں سے پہلے مظفر شاہ نے ۱۴۰۱ء میں خودمختاری کا اعلان کیا۔ اور ۱۵۷۲ء میں جب تک اکبر نے گجرات کو دوبارہ فتح نہ کیا، یہ علاقہ خودمختار رہا۔شاہان گجرات میں سب سے بااقتدار حاکم سلطان محمود بے گڑھ تھا،جس نے ۱۴۵۵ء سے ۱۵۰۰ء تک بڑی شان وشوکت سے حکومت کی۔اس نے احمد آباد کو" جسے اس کے دادا احمد شاہ نے آباد کیا تھا" بڑی رونق دی اور مصطفی آباد،محمود آباد وغیرہ کئی شہر آباد کئے۔ گجرات اور کاٹھیاواڑ میں ابھی تک کئی مضبوط قلعے ایسے تھے، جو قدیم زمانے سے ہندوراجاؤں کے ہاتھوں میں چلے آتے تھے اور مسلمان انہیں زیر نہ کر سکے تھے۔

سلطان نے انہیں فتح کر کے ملک کا نظم ونسق آسان کیا۔سلطان نے دوتین مرتبہ سندھ پر بھی حملہ کیا، ۱۴۷۳ء میں سندھیوں نے مقابلہ کی کوشش کی،لیکن گجراتی فوج کی آمد پر صلح کی درخواست کی،سلطان نے یہ دیکھ کر کہ سندھی مسلمان ہونے کے مدعی تھے،ان کی درخواست قبول کی اور بہت سے سندھیوں کو جونا گڑھ لایا، تا کہ انہیں اسلام کی صحیح تعلیم

دے کر واپس بھیجے۔سلطان مظفر کے بیٹے مظفر ثانی نے مالوہ کے بادشاہ محمود ثانی کو میدنی رائے سے نجات دلائی تھی۔(آب کوثر)

لودھی دور حکومت:

تغلق خاندان کا آخری بادشاہ محمود تغلق ۱۴۱۳ء میں انتقال کر گیا،اسکے بعد خاندان سادات کا پہلا بادشاہ خضر خان،تخت نشین ہوا۔یہ خاندان تقریباً چالیس سال تک حکومت کرتا رہا۔لیکن اس زمانے میں دہلی کی بادشاہت ایک عام صوبیدار کی حکومت سے زیادہ نہ تھی،اس خاندان کے آخری بادشاہ بڑے نااہل تھے،چنانچہ لاہور کے صوبیدار بہلول لودھی نے ۱۴۵۱ء میں دہلی پر قبضہ کرلیااور خاندان سادات کا خاتمہ ہوگیا۔۱۴۵۱ء سے ۱۵۲۶ء تک ہندوستان پر لودھیوں کی حکومت رہی۔یہ لوگ اصلاً پٹھان تھے اور تغلق خاندان کی حکومت میں ملازمت کرتے تھے۔ان کا اقتدار ۷۵ سال تک رہا ہے۔

بہلول لودھی:

بہلول لودھی ایک قابل بادشاہ تھا،اس نے دہلی کے تخت وتاج کا اقتدار بڑھایا،اردگرد کے علاقوں کو فتح کیااور بالآخر ۱۴۷۸ء جونپور کو فتح کرکے دہلی کی حکومت کو مزید وسعت دی۔بہلول لودھی کی وفات ۱۴۸۹ء میں ہوئی اوراس کی جگہ سکندر لودھی تخت نشین ہوا۔

سکندر لودھی:

سکندر لودھی ایک قابل اور بیدار مغز بادشاہ تھا۔اس نے آگرہ شہر کی بنیاد رکھی اور اسے اپنا دارالخلافہ بنایا۔اس کا بہت سا وقت افغان امراؤ اوراٹاوہ،چندیری اور گوالیار کے ہندوراجاؤں سے لڑائی میں گزرا،لیکن پھر بھی اس نے علم وفن کی طرف بہت توجہ کی۔اس کے زمانے میں ملتان سے دو بڑے عالم شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ دہلی تشریف لائے،انھوں نے درس وتدریس کے معیار کو بہت بلند کیا،سکندر لودھی ان بزرگوں کی بڑی قدر کرتا تھا اور شیخ عبداللہ کی درسگاہ میں خود شریک ہوتا تھااوراس خیال سے کہ اس کے جانے سے درس کا سلسلہ رک نہ جائے،چھپ کر مدرسے سے متصل گوشۂ مسجد میں بیٹھ جاتا،جہاں سے

وہ شیخ کی پوری تقریر سنتا اور فیض حاصل کرتا۔

ابراہیم لودھی:

سکندرلودھی کا جانشین ابراہیم لودھی تھا، ہندوستان کے بعض امراء اس سے نالاں تھے، انھوں نے بابر کودعوت دی، بابر ۱۵۲۶ء میں ہندوستان آیا اور پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی کو شکست دے کر ہندوستان پر قبضہ کرلیا۔مگر ۱۵۳۰ء میں بابر کا اچانک انتقال ہوگیااوراس کی جگہ ہمایوں تخت نشین ہوا، وہ ابھی تیس سالہ نو جوان تھا اور ضرورت سے زیادہ نرم دل، شیر شاہ سوری نے اسے شکست دے کر ۱۵۴۰ء میں ایران کی طرف بھگادیااور خاندان سوری کی بنیاد ڈالی۔

شیر شاہ سوری:

شیر شاہ سوری کا اصل نام فرید الدین تھا،اس کے والد حسن خان ابراہیم لودھی کی طرف سے بہار کے گورنر سلطان محمد کے یہاں ملازمت کیا کرتے تھے۔ان کی جرات وبہادری کی قدر کرتے ہوئے پانچ سو سپاہیوں کا سالار مقرر کردیااور دو جاگیریں عنایت کیں۔شیر شاہ سوری نے پانچ سال تک تخت دہلی پر حکومت کی، وہ ایک غیر معمولی آدمی تھا۔اس نے جونپور کے مدرسوں میں تعلیم پائی تھی، سکندر نامہ اور گلستاں و بوستاں اسے زبانی یادتھی، وہ قدیم سلاطین کی تاریخ کا شائق تھااور علماء وفضلاء کی بڑی قدر کرتا تھا۔علم وفضل کے علاوہ بڑا منتظم اور قابل حاکم تھا، اوراسی قابلیت کے زور سے ایک معمولی جاگیردار کے عہدے سے ترقی کرتا ہوا ہندوستان کا بادشاہ بن گیا۔ بدقسمتی سے اسے تخت دہلی پر فقط پانچ سال بیٹھنا نصیب ہوا، اس عرصے میں بھی اسے لڑائیوں سے فرصت نہ ملی، لیکن تھوڑی سی مدت ہی میں اس نے انتظام سلطنت میں نمایاں اصلاحیں کیں، جنہیں شمالی ہندوستان میں اکبراور دکن میں عالم گیر نے وسعت دے کر ملک کی خوشحالی کا انتظام کیا۔

شیر شاہ سوری نے اپنے مختصر دور حکومت میں چار عظیم سڑکیں بنوائیں، پہلی سڑک سنار گاؤں موجودہ بنگلہ دیش سے شروع ہوکر آگرہ، دہلی اور لاہور ہوتے ہوئے دریائے سندھ پہنچتی ہے۔دوسری سڑک آگرہ سے بنارس تک جاتی ہے۔تیسری آگرہ سے جودھ پور

جاتی ہے اور چوتھی لاہوراور ملتان کو ملاتی ہے۔مزے کی بات یہ کہ شیر شاہ سوری نے ان سڑکوں پر ایک ہزار سات سوسرائیں بنوائیں۔شیر شاہ سوری ۱۵۴۵ء میں کالنجر کی مہم میں شہید ہوگیا تھااوراس کی جگہ اسلام شاہ سوری تخت نشین ہوا۔اس کا زمانہ مختلف جھگڑوں میں گزرااور جب ۱۵۵۴ء میں وہ مرگیا تو مغلوں نے اس کے جانشین سے تخت دہلی چھین لیا اور ۱۵۵۵میں ہمایوں پھر دہلی اور آگرہ پر قابض ہوگیا۔(رودکوثر)

طوائف الملوکی، لودھی
اور سوری دور میں پرتاپ گڑھ

(۱) پرتاپ گڑھ سلطان الشرق کے زیر نگیں:

۱۳۹۴ء میں سلطان محمد تغلق کا وزیر ''خواجہ جہاں ملک سرور'' قنوج سے بہار تک علاقہ کا حاکم تھا، پرتاپ گڑھ کا علاقہ بھی اس کے زیر عمل تھا۔ بعد میں اس نے جب سلطان الشرق کا لقب اختیار کر کے جونپور میں خود مختار شرقی سلطنت کی بنیاد رکھی، تو پرتاپ گڑھ کو اپنے قبضے میں برقرار رکھا۔ اس طرح یہ علاقہ شرقی حکمرانوں کے زیر نگیں رہا، یہاں تک کہ بہلول لودھی نے آخری شرقی حکمراں حسین شاہ کو شکست دے کر شرقی حکومت کا خاتمہ کر دیا تو یہ علاقہ لودھی سلطنت کے زیر نگیں آ گیا۔

(۲) گوتم دیو:

بہلول لودھی نے اپنے بیٹے عالم شاہ کو مانک پور کا حاکم بنایا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی دور میں سوم بنشی خاندان کے راجہ سلطان شاہ کا لڑکا ''گوتم دیو'' شاہی لشکر میں شامل ہوا، اور اُسے چوراسی (پہلے گورکھپور اور اب دیوریا علاقہ) کے باغی راجہ ''ہند پال'' کی سرکوبی کی مہم تفویض ہوئی، جسے اس نے کامیابی کے ساتھ سر کیا۔

(۳) مبارک خان حاکم مانک پور:

سکندر لودھی (۱۴۸۹ء تا ۱۵۱۷ء) کی تخت نشینی تک شاہ عالم مانک پور کا حاکم رہا۔ سکندر لودھی نے مبارک خان کو نیا گورنر نامزد کیا۔ ۱۴۹۲ء میں ''جوگا رائے'' کی سرکردگی میں ارر (پرتاپ گڑھ) کے بجگوٹی راجپوتوں نے مبارک خان حاکم مانک پور کے خلاف بغاوت

کردی۔جس میں مبارک خان کو شکست ہوئی۔مجبوراً وہ گنگا کی ترائی جھونسی الہ آباد کی طرف بھاگ نکلا۔مگر ایک ملاح نے اسے گرفتار کر کے باغیوں کے حوالہ کر دیا۔مبارک خان کی گلوخلاصی اس وقت ممکن ہوئی، جب بادشاہ،مبارک خان کے بھائی بربک شاہ اوردیگر امراء کے ہمراہ خود الہ آباد کے قریب پہونچا۔بادشاہ نے مانک پور کو مبارک خان کی ملکیت میں برقرار رکھا۔

(۵) شاہ حسام الدین کے فرزند محمود:

سلطان سکندر لودھی حضرت مولانا شاہ حسام الدین مانک پوریؒ سے بھی عقیدت رکھتا تھا، چنانچہ اس نے حضرت کے فرزندار جمند مولانا محمود شاہ تھن کو غازی پور کا میر عدل نامزد کردیا۔

(٦) اعظم ہمایوں حاکم مانک پور:

۱۵۱۷ء میں ابراہیم لودھی تخت نشین ہوا تو اس نے مبارک خان کی جگہ اعظم ہمایوں شیروانی کو مانک پور کڑے کا حاکم بنادیا۔اعظم ہمایوں غیر معمولی اثر ورسوخ کا حامل شخص تھا، بعد کو اسے قلعہ کے محاصرہ کی مہم بھی تفویض ہوئی، جہاں بادشاہ کا باغی بھائی ’’جلال الدین خان‘‘ پناہ لئے ہوئے تھا۔اس وقت مانک پور کی حکمرانی اعظم ہمایوں کے لڑکے اسلام خان کو دیدی گئی۔البتہ بادشاہ کا باغی بھائی جلال الدین جب گوالیئر سے مالوہ فرار ہونے میں کامیاب گیا تو بادشاہ کو، اعظم ہمایوں اوراس کے لڑکے فتح خان جو اس مہم میں اپنے والد کے ہمراہ تھا، دونوں کی دیانت میں شبہ ہوا، چنانچہ اس نے دونوں کو آگرہ (دارالسلطنت) طلب کیا اور رسوا کر کے قید خانہ میں ڈالوادیا۔حاکم مانک پور اسلام خان نے یہ خبر سنی تو ۱۵۲٦ء میں کھلم کھلا بغاوت پر اتر آیا۔چنانچہ ابراہیم لودھی نے اس کی جگہ ’’احمد خان‘‘ کو علاقہ کا گورنر بنادیا،لیکن اسلام خان نے اسے شکست سے دوچار کردیا۔اب بادشاہ نے خود اسلام خان کی بغاوت کو فرو کرنے کی نیت سے کوچ کیا۔اسلام خان شکست کھا کر مارا گیا۔یہ جنگ قنوج کے قریب ’’بانگر مئو‘‘ میں لڑی گئی تھی۔زیادہ دنوں تک یہ علاقہ ابراہیم لودھی کے ہاتھ نہیں رہ سکا،اس لئے کہ اسی سال اپریل میں پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی بابر کے ہاتھوں شکست کھا کر مارا گیا۔اور یہ علاقہ مغلوں کے زیر نگیں آگیا۔(گزیٹیر)

(۷) سلطان جنید برلا:

بابر نے سلطان جنید برلا کو مانک پور و جونپور کا حاکم مقرر کیا اور چونکہ ابھی مانک پور کے علاقہ میں پٹھانوں کا دبدبہ تھا اور یہاں کے لوگ شاہزادہ محمود لودھی بن سکندر لودھی کی سرکردگی میں سرگرم تھے، ان کی سرکوبی کے لئے بابر نے خود ایک لشکر کے ہمراہ مانک پور کا رخ کیا، اور کڑا کے علاقہ ''ڈگڈگی'' تک آیا بھی، مگر چند دنوں بعد اس کا انتقال ہو گیا، تاریخ وفات ۲۶ / دسمبر ۱۵۳۰ء ہے۔ اس کے بعد ہمایوں تخت شاہی کا وارث ہوا۔ ہمایوں نے لڑائی جاری رکھی اور محمود لودھی کے ساتھ لڑنے والے پٹھانوں کو ۱۵۲۳ء میں بمقام ''ددرا'' میں شکست سے دو چار کیا۔ اس طرح موجودہ پرتاپ گڑھ کا پورا علاقہ ہمایوں کے زیر نگیں آ گیا۔ ہمایوں نے سلطان جنید برلا کو گورنر کے عہدہ پر بحال رکھا۔ مگر دوسرے سال سلطان جنید برلا شیر شاہ سوری سے جاملا۔ شیر شاہ سوری نے ۱۵۳۹ء میں بمقام ''چوسا'' ہمایوں کو شکست سے دو چار کر کے ازسرنو پٹھانوں کی حکومت بحال کر دی۔ (گزیٹیر)

(۸) شیخ قاسم کا نکاح سوری شہزادی سے:

شیر شاہ سوری کے دور حکومت میں مانک پور کو غیر معمولی اہمیت حاصل رہی، چنانچہ اب علاقہ کا گورنر جونپور کے بجائے مانک پور میں رہنے لگا۔ مولانا اسماعیل قریشی (واضح رہے کہ شیخ اسماعیل قریشی دو ہیں، ایک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نسل سے ہیں اور دوسرے حضرت ھبار بن اسود کی نسل سے۔ شیخ اسماعیل جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نسل سے تھے اور التمش کے دور حکومت میں مانک پور آ کر آباد ہو گئے تھے، ان کے خاندان کو شاہی گھرانہ میں رشتہ قرابت کا اعزاز ملا۔ اس خانوادے کے مشہور بزرگ شاہ حسام الدین مانک پوری رحمۃ اللہ علیہ تھے، جن کی چوتھی نسل میں شیخ محمد قاسم ہیں۔ انہیں شیخ محمد قاسم کا نکاح شیر شاہ سوری کی شہزادی بی بی صالحہ سے ہوا، جو سلیمان خاتون کے نام سے مشہور تھیں۔ یہ رشتہ نکاح اس وقت ہوا جب ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ سوری خضر خان کی بغاوت کچلنے کے لئے بنگال جاتے ہوئے مانک پور میں خیمہ زن تھا۔ بی بی صالحہ کا انتقال مانک پور ہی میں ہوا اور آج بھی ان کا مزار احاطہ خانقاہ میں زیارت گاہ عام و خاص ہے۔

مغلیہ دور سلطنت

مغل دراصل منگول کی بگڑی ہوئی شکل ہے، منگولیا کے رہنے والوں کو منگول کہا جاتا تھا جو وسط ایشیاء میں روس اور چین کے درمیان واقع ایک ملک ہے۔ یہ بڑی جنگجو قوم تھی۔ ان کو تاتاری اور تیموری بھی کہا جاتا تھا۔ اسلامی ہندوستان کے ابتدائی دور کی تاریخ پڑھیں تو مغلوں سے زیادہ ہیبت ناک اور قابل نفرت کوئی دوسرا نہیں دکھتا۔ سلاطین ہند کے لئے سب سے بڑا فتنہ ''مغول'' کا سد باب تھا، باقی باتیں ضمنی اور جزوی تھیں۔ لیکن قدرت کے طریقے عجیب ہیں، جب ہندوستان میں اسلامی حکومت کی کمزوری سے وہ فصیل جو غیاث الدین بلبن اور علاء الدین خلجی نے مغلوں کے خلاف قائم کی تھی، ٹوٹ گئی اور ہندوستان پر مغلوں کا تسلط ہو گیا تو اسلامی ہندوستان کے سب سے زیادہ شاندار اور پر امن دور کا آغاز ہوا۔

''پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے''

مغلیہ حکومت کا بانی بابر تھا، جو امیر تیمور کی نسل سے چغتائی ترک تھا۔ ہندوستان پر مغلیہ خاندان نے تین سو سال سے زائد عرصہ تک یعنی ۱۵۲۶ء تا ۱۸۵۷ء تک حکمرانی کی۔ بیچ میں چند سالوں کیلئے فرید خان شیر شاہ سوری نے ہمایوں سے حکومت چھین لی تھی اور خود بہار، بنگال، دہلی، سندھ اور پنجاب پر حکومت کی۔ یاد رہے کہ ہندوستان کی قدیم اقوام میں شمال مشرق سے آنے والی ایک اور قوم کا نام بھی منگول ہے، جو آج کل تبتی، نیپالی اور بھوٹانی کہلاتے ہیں۔

سلطان بابر:

بابر نے دہلی کو فتح کرلیا، لیکن دہلی کی فتح سے ہندوستان فتح نہ ہوا تھا۔ مرکزی حکومت

کی کمزوری سے ہر طرف صوبیدار خودمختار ہو گئے تھے، شمالی ہندوستان میں رانا سانگا نے بڑا اقتدار حاصل کرلیا تھا اور بابر کا سب سے بڑا معرکہ ۱۵۲۹ء میں اسی کے ساتھ ہوا۔ حکومت دہلی کے کمزور ہوجانے پر بہت سے ہندوراجاؤں نے سر اٹھایا، وہ بھی رانا سانگا کے ساتھ تھے، اس کا اپنا لشکر ایک لاکھ کا تھا، مارواڑ، چندیری اور دونگرپور کے راجاؤں اور دوسرے راجپوت رؤساء نے پچاس ہزار سوار اس میں اوراضافہ کئے اور لودھیوں کوملاکر قریب قریب پونے دولاکھ فوج بابر کے مقابلے میں آئی۔ راج پوت جانتے تھے کہ اس لڑائی سے شمالی ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے، اس لئے جان توڑ کے لڑے اور بابر کی فوج کے ہراول دستے کوشکست دی اور بیانہ کی فوج جوان کی مدد کوگئی تھی، اسے بھی شکست کھا کر محصور ہونا پڑا۔ مغل لشکر پر خوف وہراس طاری ہوا اور بعض لوگوں نے کہا کہ بڑے قلعے معتمد سرداروں کے حوالے کر کے پنجاب لوٹ جانا چاہئے۔ مگر بابر نے ایک پر جوش ولولہ انگیز تقریر کی اور کہا کہ اطراف واکناف کے مسلمان بادشاہ ہم پر اظہار نفرت کریں گے اور کہیں گے کہ ہم زندگی کو عزیز سمجھ کر ایک بڑی سلطنت کو ہاتھ سے کھوبیٹھے، جوانمردی کا تقاضہ ہے کہ ہم شہادت کے لئے تیار ہوجائیں۔ بابر کی اس تقریر سے بڑا جوش پیدا ہوا اور سب نے قسمیں کھائیں کہ ہم میدان سے منہ نہیں موڑیں گے۔ مر گئے تو شہید اور کامیاب ہوگئے تو غازی۔

بابر نے خود بھی شراب نوشی اور دوسرے غیر شرعی امور حتی کہ داڑھی منڈانے سے توبہ کی اور اللہ تعالی سے دعا کر کے میدان جنگ میں آگے بڑھا، جان توڑ لڑائی ہوئی اور فتح بابر کے ہاتھ رہی۔ "سیکری'' کی لڑائی میں جو راجپوت، رانا سانگا کی مدد کو آئے تھے، ان میں چندیری کا راجا میدنی رائے بھی تھا، رانا سانگا کو شکست دینے کے کچھ عرصہ بعد بابر نے چندیری کا رخ کیا اور اسے بھی فتح کرلیا۔

بابر کی شخصیت میں ایک خاص دلکشی تھی، اسے ہندوستان میں بہت عرصے رہنے کا موقع نہیں ملا، لیکن اپنی فطری ذہانت سے اس نے جلد ہی یہاں کی خصوصیات پالیں۔ اس نے اپنے بیٹے ہمایوں کے لئے جو وصیت لکھی، اس سے اس کی سمجھ، انصاف پسندی اور

مدبرانہ قابلیت کا پتہ چلتا ہے، وہ لکھتا ہے:

''فرزندمن! ہندوستان میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں اور یہ اللہ تعالی کی بڑی عنایت ہے کہ اس نے تمہیں اس ملک کا بادشاہ بنایا ہے، اپنی بادشاہی میں تمہیں ذیل کی باتوں کا خیال رکھنا چاہئے:

(۱) تم مذہبی تعصب کو اپنے دل میں جگہ نہ دو اور لوگوں کے مذہبی جذبات اور مذہبی رسوم کا خیال رکھتے ہوئے رورعایت کے بغیر سب کے ساتھ پورا پورا انصاف کرنا۔

(۲) گاؤکشی سے بالخصوص پرہیز کرو تاکہ اس سے تمہیں لوگوں کے دل میں جگہ مل جائے اور اس طرح وہ احسان اور شکریے کی زنجیر سے تمہارے مطیع ہو جائیں۔

(۳) تمھیں کسی قوم کی عبادت گاہ مسمار نہیں کرنی چاہئے، اور ہمیشہ سب سے پورا انصاف کرنا چاہئے، تاکہ بادشاہ اور رعیت کے تعلقات دوستانہ ہوں اور ملک میں امن وامان رہے۔

(۴) اسلام کی اشاعت ظلم وستم کی تلوار کے مقابلے میں لطف وکرم واحسان کی تلوار سے بہتر ہو سکے گی۔ (رودکوثر)

ہمایوں:

بابر کی وفات ۱۵۳۰ء میں ہوئی، اس کی جگہ ہمایوں نے لی۔ ۱۵۴۰ء میں ہمایوں کو شیر شاہ سوری نے شکست دیدی۔ ہمایوں ان ایام میں راج پوتانہ اور سندھ کے ریگستان میں پریشان پھرتا رہا، انہیں ایام میں عمرکوٹ کے مقام پر بیٹا ''اکبر'' پیدا ہوا۔ ہمایوں جب ہندوستان کی طرف سے بالکل مایوس ہو گیا اور اس کے بھائیوں نے اس کی کوئی مدد نہ کی تو اس نے ایران کا رخ کیا۔ شاہ ایران طہماسپ صفوی اس کے ساتھ بڑے حسن وسلوک سے پیش آیا۔ اور جب ایک عرصہ قیام کے بعد ہمایوں نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا تو اسے فوج دی، جس کی مدد سے اس نے ۱۵۴۵ء میں قندھار اور ۱۵۵۰ء میں کابل فتح کرلیا۔ ۱۵۵۵ء میں ہندوستان آیا اور دہلی وآگرہ پر قابض ہو گیا۔ لیکن ابھی اپنی حکومت مستحکم کرنے کا اسے موقع نہ ملا تھا کہ وہ اپنے کتب خانے کی سیڑھیوں سے پھسلا اور گر کر مر گیا،

حکومت کے استحکام کا کام اکبراوراس کے اتالیق بیرم خان کو کرنا پڑا۔

ہمایوں جب سفرایران کے بعد ہندوستان واپس آیا تو اس کے ساتھ بے شمار ایرانی سپاہی، امراء اور علماء تھے، اوراسی وقت سے ایران وہندوستان کے زیادہ قریبی تعلقات کا آغاز ہوا۔جن کی وجہ سے ہندوستان میں ایرانیوں کا عمل دخل بہت بڑھ گیا، اور ہندوستان کی اسلامی تہذیب میں عربی اثرات کے بجائے ایرانی وشیعی اثرات نمایاں ہو گئے۔بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمایوں خود بھی شیعہ ہو گیا تھا اوراسے شاہ ایران سے مدد اسی وعدہ پر ملی تھی کہ وہ اپنی مملکت میں شیعی عقائد کی ترویج کرے گا، یہ تو غالباً غلط ہے، لیکن اتنا قرین قیاس ہے کہ جب وہ ہندوستان واپس آیا تو شیعہ عمال کا عمل دخل بہت زیادہ ہو گیا اورانہیں مذہبی معاملات میں زیادہ آزادی مل گئی، ہمایوں کا وزیر اوراکبر کا اتالیق بیرم خان خود شیعہ تھا،اور شیخ گدائی جنہیں عہد اکبری میں سب سے پہلے شیخ الاسلام کا عہدملا، شیعی عقائد کا تھا۔(رودکوثر)

بہرکیف! یہ ایسی سودہ بازی تھی، جس کی بڑی بھاری قیمت بعد کو چکانی پڑی۔اور جس کے برے اثرات کا کامیاب استیصال اورنگ زیب عالمگیر جیسے اولوالعزم بادشاہ سے بھی نہ ہوسکا۔چنانچہ حکومت بھی گئی اور دین میں رخنہ بھی پڑا، اہل سنت والجماعت کے درمیان نئے نئے بدعتی فرقے نمودار ہوئے، یہ جراثیم اگرچہ پہلے سے ہی مسلمانان ہند کو لگ چکے تھے، لیکن اب شاہی سرپرستی کی وجہ سے مہلک شکل اختیار کر گئے، چنانچہ تصوف کی کتابوں میں شرک وبدعت کی آمیزش کے ساتھ ساتھ تاریخ وادب مکمل طور پر شیعی وایرانی رنگ میں رنگ اٹھے۔

"لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی"

ہمایوں کے بعد شیعوں کی ایک بڑی تعداد ایران سے اس زمانے میں بھی آئی، جب وہاں ۱۵۷۶ء میں شاہ اسماعیل ثانی نے اہل سنت والجماعت کا طریقہ اختیار کیا اور سنی عقائد کے عارضی فروغ کے دوران شیعوں پر سختی شروع ہوئی۔اس وقت شیعوں کی آمد کا سلسلہ اور وسیع ہو گیا اور شمالی ہندوستان میں بھی شیعوں کی معقول تعداد ہو گئی۔حتی کہ ایک انگریز

اہل قلم ''ہیسٹر'' کے اندازے کے مطابق اورنگ زیب کے امراء میں بڑی تعداد شیعوں کی تھی۔ یہی بنیاد تھی جس کی وجہ سے اٹھارہویں صدی میں اودھ اور مرشد آباد وغیرہ میں شیعی ریاستوں کا قیام ہوا۔

اکبر بادشاہ

ہمایوں نے شاہ ایران کی مدد سے شیر شاہ سوری کے پوتے سکندر سور کو شکست دے کر دہلی وآگرہ پر قبضہ کرلیا، تاہم ہمایوں کو ہندوستان میں دوبارہ آئے ہوئے چند مہینے گزرے تھے اور خاندان سور اور مغلوں میں کشمکش ابھی جاری تھی کہ بادشاہ ایک اتفاقی حادثے کا شکار ہو گیا اور دہلی وآگرہ پھر خاندان سور کے ہاتھ چلے گئے۔

اس وقت ہمایوں کے بیٹے اکبر کی عمر تیرہ سال تھی، وہ ۱۵۵۶ میں تخت نشین ہوا، اور اس کی تخت نشینی سے اسلامی ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ایک بالکل نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس کی پہلی لڑائی پانی پت کے میدان میں عادل شاہ سوری کی فوجوں سے ہوئی، میدان اس کے ہاتھ رہا، اس کے بعد ملک میں جو صوبے خودمختار ہو گئے تھے اور طویل مدت سے آزاد تھے، انہیں پھر سے حکومت دہلی کے تابع کیا۔

بیرم خان کی ۱۵۶۰ء میں معزولی کے بعد اکبر خودمختار بادشاہ ہو گیا۔ مالوہ، گونڈوانہ وغیرہ کو ۱۵۶۴ء تک فتح کرلیا، اس سے دوسال پہلے اکبر نے جے پور کے راجا بہاری مل سے مصالحت کرلی تھی، راجا نے اکبر کی اطاعت قبول کی اور اپنے خاندان کی ایک رانی سے شادی کی۔ راجا بہاری مل کے بیٹے اور راجا بھگوان داس اور پوتے مان سنگھ کو اعلیٰ منصب ملے۔ پھر چتوڑ، کالنجر اور تھنبور مغلوں کے قبضے میں آئے۔ پھر جیسلمیر اور بیکانیر کے راجاؤں نے اطاعت قبول کی۔ ۱۵۷۲ء میں گجرات فتح ہوا، اور ۱۵۷۶ء میں تکرائی کی جنگ کے بعد بنگال پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۵۸۵ء سے ۱۵۹۵ء تک اکبر لاہور میں مقیم رہا، اس دوران کشمیر، جو کبھی بھی حکومت دہلی کے تابع نہ ہوا، فتح ہوا، پھر سندھ، اڑیسہ مقبوضات اکبری میں شامل ہوئے۔ ۱۵۹۵ء میں بلوچستان فتح ہوا اور قندھار اکبر کے قبضے میں آ گیا۔ اب اکبر نے دکن کی طرف توجہ کی، چنانچہ ۱۵۹۸ء میں احمد نگر کا قلعہ فتح ہوا، ۱۶۰۱ء میں خاندیش کا مضبوط

قلعہ اسیر گڑھ فتح ہوا۔ اس کے بعد اکبر آگرہ واپس آیا اور مر گیا۔

اکبر کی مسلسل فتوحات، اسے تاریخ میں ایک خاص درجہ دیتی ہیں، لیکن ملک گیری آسان، ملک رانی مشکل۔ اکبر کا اس سے بھی اہم کام اس وسیع سلطنت کا کامیاب نظم ونسق اور ملکی حکومت کے لئے نظام مرتب کرنا ہے، جو معمولی تبدیلی کے ساتھ تمام مغلیہ دور میں برقرار رہا۔ اور کئی امور برطانوی نظام حکومت کی بنیاد بنے، جس پر بھارت اور پاکستان اب بھی عمل پیرا ہیں۔ اس نے دور دراز صوبوں پر مرکزی حکومت کی مسلسل گرفت اور بغاوتوں سے بچنے کے لئے اعلی اسامیوں کے لئے ایک منصب داری نظام قائم کر دیا، جس کے اراکین ملک کی تمام اہم اسامیوں پر فائز ہوتے تھے، اچھی کارکردگی کی بنا پر ان کی ترقی کے امکانات ہوتے تھے۔ انہیں ایک علاقے سے دوسرے علاقوں میں تبدیل کیا جاتا رہتا تھا۔ ان لوگوں کے انتخاب اور تربیت پر بڑی توجہ دی جاتی تھی۔ تیسرا اہم کارنامہ زمین کا بندوبست تھا، جو اب بھی معمولی ترمیمات کے ساتھ ملک میں رائج ہے۔

اکبر کا دائرہ عمل ملک گیری اور ملک رانی میں بے نظیر تھا اور مسلم حکومت کو جس طرح اس نے مستحکم کیا، کسی اور ہندوستانی بادشاہ سے نہیں ہوا۔ لیکن افسوس کہ اس نے اپنے صحیح دائرۂ عمل کو چھوڑ کر مذہبی معاملات میں بھی دخل دیا اور خوشامدی ودرباریوں کی واہ واہی میں بعض ایسی غلطیوں کا مرتکب بھی ہوا کہ آج اس کے سیاسی احسانات بھی فراموش ہو گئے۔ اسی خرابی کی اصلاح کے لئے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کمربستہ ہوئے تھے۔

جہانگیر:

اکبر کی وفات ۱۶۰۵ء میں ہوئی اور اس کی جگہ جہانگیر تخت نشین ہوا۔ اس نے عہد اکبری کے بیشتر قواعد جو شریعت کے خلاف تھے، موقوف کر دئے۔ اکبر کے آخری ایام میں کوشش ہو رہی تھی کہ جہانگیر کے بجائے اس کا بیٹا خسرو اکبر کا جانشین ہو، خسرو کی بیوی خان اعظم کی بیٹی تھی اور وہ راجا مان سنگھ کا بھی قرابت دار تھا، ان دونوں نے اس کے حق میں کوشش کی، لیکن حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مسترشد خاص شیخ فرید بخاری جنھیں بعد میں نواب مرتضی خان کا خطاب ملا، اور دوسرے مسلم امراء نے اس موقعہ پر قابلیت

دکھائی، انھوں نے نہ صرف جہانگیر کی تخت نشینی کا انتظام کیا، بلکہ نئے بادشاہ سے اس بات کا وعدہ بھی لیا کہ وہ قوانین اسلام کا احترام کرے گا۔ چنانچہ اس نے بالعموم شرع اسلامی کی پاسداری کے وعدے کا ایفا کیا اور اگر اکبر کے مذہبی بوالعجبیوں کا کوئی اثر باقی تھا، تو وہ عہد جہانگیری میں ناپید ہو گیا۔ بعد میں بڑے بیٹے خسرو نے بغاوت کی تو اسے شکست دی۔ شہزادہ شاہجہاں نے میواڑ کے رانا امر سنگھ کو شکست دی اور ۱۶۲۰ء میں جہانگیر نے کانگڑھ کو خود فتح کیا ۱۶۲۷ء میں وفات پائی۔

شاہجہاں:

جہانگیر کی وفات کے بعد مختلف شہزادے دعوائے شہنشاہی لے کر اٹھے، مگر شاہ جہاں اپنی زور و صلاحیت کی بنا پر ۱۶۲۸ء میں تخت نشین ہوا۔ شاہجہاں کے زمانے میں وہ رد عمل جو اکبری طریق کار کے خلاف جہانگیر کے عہد حکومت میں شروع ہوا تھا، اور بھی قوی ہو گیا اور اسلام اور شعائر اسلام پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ جہانگیر کے زمانے میں عام لوگوں کے لئے سجدہ درباری برقرار تھا، شاہجہاں نے اسے موقوف کر دیا۔ وہ شریعت کے مطابق مقدمات فیصل کرتا اور علماء و فضلاء کا بھی بڑا قدرداں تھا، نماز روزہ کا پابند تھا۔ شاہجہاں کا دور حکومت خاندان مغلیہ کا سب سے زیادہ پر شکوہ اور شاندار عہد حکومت تھا۔ اس بادشاہ کو فن تعمیر میں بھی مہارت حاصل تھی، اسی کے زمانے میں تاج محل، لال قلعہ، جامع مسجد، جہانگیر کا مقبرہ اور دیگر عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ شاہجہاں کی بیماری کے زمانے میں داراشکوہ نے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے، اس کے لئے شاہزادوں میں جنگ ہوئی، عالمگیر فتح یاب ہوئے۔ اس طرح شاہجہاں ۳۰ سال حکومت کرنے کے بعد بالآخر ۱۶۵۸ء میں معزول ہو گئے، ان کی وفات ۱۶۶۶ء میں ہوئی اور تاج محل کے اندر دفن ہوئے۔

اورنگ زیب عالمگیر:

شاہجہاں کی بیماری کے زمانے میں داراشکوہ نے جلد بازی میں زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی، اس کی وجہ سے شاہجہاں کی موت کی افواہیں پھیلنے لگیں اور ملک میں

ابتری پھیل گئی۔شاہ شجاع نے بنگال میں اپنی حکومت قائم کرلی اورآگرہ پرفوج کشی کے ارادہ سے روانہ ہوا۔بنارس کےقریب جنگ ہوئی جس میں داراشکوہ کوفتح اورشجاع کوشکست ہوئی . اورنگ زیب نے مراد سے مل کرداراشکوہ کے مقابلے کی ٹھانی،اجین کےقریب دونوں فوجوں کامقابلہ ہوا،عالم گیرکوفتح ملی۔

عالم گیررحمۃ اللہ علیہ نے ہندوؤں اورمسلمانوں کی فضول رسمیں ختم کیں،فحاشی کاانسداد کیا،خوبصورت مقبروں کی تعمیراورآرائش ممنوع قراردی۔قوال،نجومی،شاعرسب کے وظیفے موقوف کردیئے۔شراب،افیون اوربھنگ بندکردی۔ درشن اورجھروکا کی رسم ختم کی اور بادشاہ کوسلام کرنے کااسلامی طریقہ رائج کیا۔سجدہ کرنااور ہاتھ اٹھانا موقوف ہوا،سکوں پر کلمہ لکھنے کادستوربھی ختم ہوا۔کھانے کی جنسوں پرمحصول ہٹادئے۔۱۶۶۵ءمیں آسام،بہار اورچاٹ گام فتح کئےاور پرتگیزی اورفرنگی قزاقوں کاخاتمہ کیا۔عالم گیرنے ۱۶۶۶ءمیں راجا جے سنگھ اوردلبرخان کوشیواجی کے خلاف بھیجا،انھوں نے بہت سے قلعے فتح کئے،شیواجی اوراس کابیٹا آگرہ میں نظربند ہوئے۔شیواجی فرار ہوکر پھرمہاراشٹرا پہنچ گیااور دوبارہ قتل وغارت گری شروع کی۔۱۶۸۰ءمیں شیواجی مرگیاتواس کا بیٹا سنبھاجی جانشین ہوا،یہ بھی قتل وغارت گری میں مصروف ہوا،عالم گیرخود دکن پہونچے،سنبھاجی گرفتار ہوا، اور مارا گیا۔اس کا بیٹا ساہودہلی میں نظربند ہوا۔دکن کامطالعہ کرکے عالم گیراس نظریہ پر پہنچے کہ بیجاپور اورگولکنڈھ کی ریاستوں سے مرہٹوں کومدد ملتی ہے،اس لئے ۱۶۸۶ء میں بیجاپور اور۱۶۸۷ءمیں گولکنڈہ کی ریاستیں ختم کردیں،اسکے بعدمرہٹوں کےتعاقب میں ہندوستان کےانتہائی جنوبی حصے بھی فتح کرلئے اورمغلیہ سلطنت پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔عالم گیراحمدنگرمیں بیمارہوئے اور ۳/مارچ/۱۷۰۷ءکونوے برس کی عمرمیں فوت ہوئے۔

اورنگ زیب عالمگیر کے جانشین:

اورنگ زیب کی وفات کے بعد بہت جلد مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوگیا۔اورنگ زیب کی وفات ۹۰ سال کی عمر میں ہوئی۔جب ان کا بیٹا بہادرشاہ اول جانشین ہواتو وہ خود بوڑھا تھااوراسے پانچ سال سے زیادہ حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا۔اس کے زمانے

میں پہلے راجپوتوں نے اور پھر سکھوں کے " سرگروہ بندہ " نے مغلوں کے علاقوں کو لوٹا۔ راجپوتوں کی بغاوت اس نے خود رفع کردی، لیکن سرگروہ بندہ کا قلع قمع فرخ سیر نے کیا۔ جو ۱۷۱۳ء سے ۱۷۱۹ء تک حکمران رہا۔ کئی لحاظ سے وہ سمجھ دار اور قابل حکمران تھا، لیکن اس کے زمانے میں مسلمان امراء کے دو فریق ہو چکے تھے، شیعہ اور سنی۔ ان کے اختلاف نے اسلامی حکومت کا خاتمہ کردیا۔

عہد مغلیہ میں پرتاپ گڑھ

مغل اور پٹھانوں کی کشمکش:

اندازہ ہوتا ہے کہ شیر شاہ سوری متوفی ۱۵۴۵ء اوران کے لڑکے اسلام شاہ متوفی ۱۵۵۳ء کے بعد پرتاپ گڑھ کا علاقہ برائے نام دوسرے پٹھان سردار عادل شاہ کے زیرنگیں رہا۔ عادل شاہ کو ہمایوں نے شکست دی تھی۔ مگراب بھی یہ علاقہ پٹھانوں کے زیر تسلط تھااور یہ صورت حال اس وقت بھی تھی، جب ۱۵۵۹ میں مغلوں کی طرف سے بہرام خان کو جونپور کی گوشمالی کی مہم تفویض ہوئی، جس میں اسے کامیابی ملی، مگر حکومتی نظام ابھی مستحکم نہیں تھا، اس لئے عادل شاہ کے لڑکے شیر خان نے مشرقی سلطنت کو واپس لینے کی کوشش کی۔ جونپور میں علی قلی خان زماں سرکاری سپہ سالار تھا، بہرام خان کی اجازت سے اس نے پٹھانوں کو ''چنار'' جونپور روڈ پر شکست دی اور اکبر سے ملاقات کی غرض سے کڑا مانک پور گیا۔ چونکہ بہرام پر غداری کا شبہ تھا، اس لئے اکبر کی طرف سے اب اس کا نہ صرف پرجوش استقبال ہوا، بلکہ اس کی سپہ سالاری کی توثیق بھی ہوگئی۔ اکبر نے ۱۵۶۲ء میں کمال خان کو مانک پور کڑے کا گورنر نامزد کردیا، اس کی جگہ ۱۵۶۴ء میں آصف خان آیا۔

خان زماں کی بغاوت:

۱۵۶۵ء میں جونپور کے گورنر علی قلی خان زمان نے اپنے بھائی بہادر خان اور چچا ابراہیم خان نیز اودھ کے گورنر خان عالم کے ساتھ مل کر حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، سرکاری فوج جو آصف خان حاکم مانک پور اور مجنوں خان قققشل حاکم کڑا کے ماتحت تھی، اس کو شکست سے دور چار کیا اور مانک پور کا محاصرہ کرلیا، البتہ یہ سلسلہ زیادہ دن برقرار نہیں

رہ سکا، اس لئے کہ اکبر نے منعم خان کو فوری طور پر بھیجا اور قنوج آکر خود بھی اس سے مل گیا اور محاصرہ ختم کرایا۔ مخالفین نے ایک مرتبہ پھر علم بغاوت بلند کیا، اکبر کی طرف سے حاکم مانک پور آصف خان کو علی قلی خان زماں کے تعاقب کا حکم ہوا تو آصف خان خود باغیوں سے جاملا۔ جب سرکاری سپہ سالار شجاعت خان نے آصف خان کو دوڑایا تو اس نے کڑا میں پناہ لے لی، چنانچہ کڑا میں جنگ شروع ہوگئی، آصف نے خان زمان سے مدد چاہی۔ اس دوران خان زماں کی بات چیت منعم خان سپہ سالار لشکر سے شروع ہوگئی اور وہ اس سے معافی کا طلب گار رہا، منعم خان کی مداخلت کے سبب بالآخر اکبر نے باغیوں کو معاف کردیا۔ البتہ ۱۵۶۶ء میں مانک پور کو اپنے ماتحت کرلیا، اس سے پہلے اکبر کی طرف سے منعم خان مانک پور کا گورنر تھا۔ ۱۵۶۷ء میں خان زماں نے ایک مرتبہ پھر بغاوت کی، پورے علاقہ بشمول پرتاپ گڑھ پر قبضہ کرلیا۔ بغاوت کو فرو کرنے کے لئے اکبر خود رائے بریلی کے راستے مانک پور کے لئے روانہ ہوا اور مجنوں خان قققشل سے ملا۔ یہ جنگ ۹/جون/ ۱۵۶۷ء میں (کڑا سے سات کلومیٹر دور) فتح پور پسوکی میں لڑی گئی، خان زمان کے قتل اور بہادر خان کی گرفتاری پر جنگ کا خاتمہ ہوا۔ اکبر نے منعم خان کو جونپور کا حاکم نامزد کیا اور خود مانک پور ہوکر آگرہ کے لئے روانہ ہوا۔

گزیٹیر لکھتا ہے: کہ اس زمانہ کی ایک یادگار ''مسجد'' کی شکل میں دیکھ سکتے ہیں جو شہر مانک پور کے قریب گاؤں شاہ پور میں ہے۔ مسجد میں چار کتبے لگے ہیں، جن پر ۹۷۲ھ - ۱۵۶۵ء درج ہے۔

مانک پور کی مرکزیت کا خاتمہ:

مغل بادشاہ اکبر نے جب الہ آباد بسایا اور اسے ایک صوبہ کا مرکز قرار دیا تو قدیم انتظامی محکموں کو از سرِنو مرتب کیا اور اپنے پورے قلمرو کو پندرہ صوبوں میں تقسیم کردیا۔ تمام صوبے پرگنے، محال اور سرکاروں پر مشتمل تھے۔ اس نے کڑا مانک پور کی مرکزیت کا خاتمہ کرتے ہوئے علاقہ پرتاپ گڑھ کا انتظام وانصرام صوبیدار الہ باد کے حوالہ کردیا، اس سے پہلے یہ عہدہ گورنر مانک پور کے پاس ہوا کرتا تھا۔ اس طرح پرتاپ گڑھ پانچ سرکاروں پر

مشتمل ہوا،جن میں سے مانک پور کو صرف ایک سرکار کے صدر دفتر تک محدود کر دیا گیا۔مانک پور سرکار میں رام پور اور بہار کے پرگنوں کو ملا یا گیا، جو (129830) بیگھہ کاشت والی زمین پر مشتمل تھا،اور یہ علاقہ ''بسن'' راجپوتوں کے عمل دخل میں آ گیا۔تحصیل کنڈہ کے زیادہ تر علاقے مانک پور محال میں تھے،تحصیل کے بقیہ علاقوں کو''خیرات گزارا'' کے عنوان سے مخصوص محال قرار دیدیا۔یہ چند گاؤں تھے,جو متعین تھے۔پرگنہ پرتاپ گڑھ سوم بنسی راجپوتوں کے حوالہ ہو گیا،جس کو محال ارر (یا ارول) کے نام سے جانا جاتا۔پرگنہ اٹھیہا سلون میں شامل ہو گیا۔تحصیل پٹی میں جلال پور اور بلکھری کو ملا دیا گیا اور برہمن و بچگوٹی راجپوت یہاں کے حاکم ہوئے۔یہ علاقہ (76517) بیگھہ کاشت والی زمین پر مشتمل تھا۔(گزیٹیر)

شمس آباد چوکا پور کی کوٹھیاں:

دور اکبری ہی میں نواب عبدالصمد علی خان گردیزی منصب دار نے مانک پور میں کئی شاندار کوٹھیاں تعمیر کرائیں اور شمس آباد کی بنیاد رکھی، جو اب ''چوکا پور'' کا حصہ ہے۔وہ عمارتیں اتنی اعلیٰ،نفیس اور خوشنما کشیدہ کاری والی تھیں کہ دوصدی بعد نواب آصف الدولہ (ان کے پتھر لکھنؤ لے گیا اور) لکھنو کے امام باڑہ کی تزئین کی۔۱۵۸۰ء میں اکبر نے اسد خان ترکمان کو مانک پور کا چارج دے کر بھیجا،تاہم اس آدمی کے بارے میں تفصیل دستیاب نہیں۔(گزیٹیر)

قاضی یعقوب مانک پوری:

قاضی یعقوب مانک پوری متوفی ۹۹۸ھ اصول وفقہ اور قضاء کے مشہور عالم تھے، اکبر نے ان کو لشکر کا قاضی بنایا، پھر ترقی دیکر پورے ملک کا قاضی القضاۃ (سپریم کورٹ کا چیف جسٹس) بنادیا تھا۔(دیار پورب علم وعلماء)

رنگ محل اور دیوان خاص کی تعمیر:

اکبر کے بعد اس کا لڑکا جہانگیر (۱۶۰۵ تا ۱۶۴۸ء) سریرائے سلطنت ہوا،

عہد جہانگیری ۱۶۰۹ء میں مانک پور کے اندر محمد دامغانی نامی ایک معمار نے تاج خان خان اعظم (تاش بیگ مغل) منصب دار کے اعزاز میں ایک مسجد تعمیر کی، اسی سال ''رنگ محل'' اور ''دیوان خاص'' بھی تعمیر کیا، جس پر لگے ہوئے کتبہ پر ۱۶۱۲ء کی تاریخ درج ہے۔

پرتاپ گڑھ کی بنیاد:

۱۶۲۸ء میں سوم بنسی راجپوت راجہ پرتاپ سنگھ نے اپنے باپ راجہ تیج سنگھ کے مرنے کے بعد اپنا صدر دفتر تیج گڑھ سے رام پور (سٹی پرتاپ گڑھ) منتقل کیا، وہاں ایک بڑا قلعہ تعمیر کیا اور علاقہ کے قدیم نام ''ارر'' کو ختم کر کے اپنے نام سے موسوم ''پرتاپ گڑھ'' کرلیا۔ راجہ پرتاپ سنگھ جنگجو طبیعت والا تھا، اس کا سب سے پہلا شکار راج شاہ ولد سمیر سنگھ ہوا، جسے اس نے کچل دیا تھا۔ اس نے رانی گنج کیتھولہ کے راجہ سے بھی جنگ کی اور اسے اپنی اطاعت پر مجبور کیا۔ پھر رائے بریلی کے راجہ سورت سنگھ سے جنگ چھیڑی۔ یہ جنگ گاؤں ہنڈور میں لڑی گئی، جس میں رائے بریلی کے راجہ کو مجبوراً پرتاپ سنگھ کی حکومت کے قیام کا راستہ ہموار کرنا پڑا۔ (گزیٹیر)

کُلہیِ نَرِیس:

راجہ پرتاپ سنگھ کے ۱۶۸۲ء میں مرنے کے بعد اس لڑکا جئے سنگھ راجہ ہوا۔ جس نے سلطنت کے رقبہ کو بھدوہی اور مرزا پور تک وسعت دی۔ اس راجہ کی رسائی اورنگ زیب عالمگیر کے دربار میں بخت بلی سنگھ کے توسط سے ہوئی، جس نے اورنگ زیب کے ایک سردار کی جانب سے بندیل کھنڈ کے راجہ چھترا سال کو زیر کرنے کی ذمہ داری لے رکھی تھی۔ یہ مہم کامیابی سے ہمکنار ہوگئی۔ تو راجہ جئے سنگھ کو دہلی طلب کیا گیا، جہاں شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب نے اسے اپنی ٹوپی عنایت کی اور اسے ''کُلہیِ نَرِیُس'' کے لقب سے نوازا۔ بعد میں اسے بطور انعام کے پرگنہ منگرا اور گروارا ملا۔ (جو ضلع جونپور کا حصہ ہے)۔ (گزیٹیر)

مغلیہ دور کا خاتمہ اور خودمختار ریاستیں

خاندان مغلیہ کے زوال کی پہلی منزل یہ ہوئی کہ فرخ سیر کو حکومت درحقیقت دکن کے بااقتدار صوبیدار سید حسین علی (شیعی) وغیرہ کی مدد سے ملی تھی۔ جب فرخ نے ان لوگوں کا اقتدار کم کرنا چاہا تو حسین شیعی نے مرہٹوں (شیواجی کے لوگوں) کو اپنے ساتھ ملا لیا، ان سے وعدہ کیا کہ بادشاہ سے تمہیں چوتھ اور سردیش مکھی کا فرمان دلوادوں گا۔ چنانچہ لشکرکشی ہوئی اور فرخ سیر معزول کردیا گیا، مرہٹوں کو دکن میں چوتھ اور سردیش مکھی کی اجازت مل گئی۔ اس کے بعد سید حسین وغیرہ نے سات مہینے کے اندر تین بادشاہ تبدیل کئے۔ سنی امراء نے ان لوگوں کے مظالم دیکھے تو انہیں قتل کردیا۔ اب ''محمد شاہ رنگیلے'' تخت نشین ہوا۔ جو ۱۷۱۹ء سے ۱۷۴۸ء تک حکمراں رہا۔ اسی بادشاہ کے زمانہ میں میر قمرالدین نظام الملک شیعی نے ۱۷۲۴ھ میں سلطنت آصفیہ کی بنیاد رکھی، سعادت علی خان برہان الملک شیعی نے ریاست اودھ اور علی وردی شیعی نے ریاست بنگال کی بنیاد ڈالی۔

نادرشاہ کا حملہ:

۱۷۳۹ء میں نادرشاہی حملے نے رہی سہی کسر پوری کردی۔ نادرشاہ ایران میں خاندان افشار شیعی حکومت کا بانی تھا، اس نے ۱۷۳۶ء تا ۱۷۴۷ء حکومت کی ہے۔ ۱۷۳۸ء میں نادرشاہ ۸۰/ ہزار فوج کے ساتھ قندھار اور کابل کی طرف نکلا اور فتح کرلیا۔ اس پر مغلیہ سلطنت کا کھوکھلاپن ظاہر ہوچکا تھا، اس لئے اس نے اب دہلی کا رخ کیا، درہ خیبر کے راستے وہ برصغیر کی حدود میں داخل ہوا اور پشاور و لاہور کو فتح کرتا ہوا ''کرنال'' کے مقام تک پہنچ گیا، جو دہلی سے صرف: ۷۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ محمد شاہ رنگیلا اپنی

عیاشیوں میں اتنا مست تھا کہ وہ اپنی فوج اور توپ خانہ کے ساتھ کرنال بھی نہیں پہنچ سکا۔ کہ جنگ شروع ہوگئی اور میدان نادر شاہ کے ہاتھ رہا۔ وہ ۱۷۳۹ء میں فاتحانہ انداز میں دہلی میں داخل ہوا، قتل عام کرایا، جس میں بیس ہزار عوام ماری گئی اور دو مہینہ تک دہلی کو لوٹا، پھر واپس چلا گیا۔ محمد شاہ رنگیلا کے بعد احمد شاہ تخت نشین ہوا۔ نظام الملک دکن کے پوتے شہاب الدین نے مرہٹوں کو اپنے ساتھ لے کر طرح طرح کے مظالم شروع کئے اور ۱۷۵۴ء میں احمد شاہ کو اندھا کر دیا گیا، تو اس کی جگہ عالمگیر ثانی کو تخت نشین کیا گیا۔

احمد شاہ ابدالی:

والی افغانستان احمد شاہ ابدالی کے پاس مرہٹوں کے مظالم کی شکایتیں پہنچیں۔ اس سلسلے میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلی سے اس کی خط و کتابت بھی ہوئی۔ اس زمانہ میں لاہور پر بھی احمد شاہ ابدالی کا قبضہ تھا اور مرہٹوں نے اس کے گورنر کو لاہور سے نکال دیا تھا۔ اب احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملے کا ارادہ کیا، ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے میدان میں بڑا معرکہ ہوا، جس میں مرہٹوں کو شکست فاش ہوئی۔ اس کے بعد احمد شاہ ابدالی ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کرسکتا تھا (اگر ایسا کر لیتا! تو شاید ہندوستان کا نقشہ آج کچھ اور ہوتا) لیکن وہ شاہ عالم کی بادشاہت تسلیم کر کے واپس چلا گیا اور شاہ عالم عنان حکومت سنبھالنے کے قابل نہ تھا۔ اسی کے زمانے میں پلاسی کا معرکہ ہوا، اور بنگال انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ اس کے بارے میں مشہور ہے: ’’حکومت شاہ عالم از دہلی تا پالم‘‘۔

پانی پت کی شکست کے بعد مرہٹے اس قابل نہ رہے کہ وہ انگریزوں سے مقابلہ کرسکیں، مگر دہلی کے شاہ کو اپنے قابو میں رکھنے کی سکت رکھتے تھے، چنانچہ جب روہیلوں کے سردار ’’غلام قادر‘‘ نے بغاوت کی اور بادشاہ کو اندھا کر کے تخت سے اتار دیا، تو مرہٹوں نے روہیلوں کے سردار غلام قادر کو شکست دی اور اسے قتل کر کے ۱۷۸۸ء میں شاہ عالم کو پھر تخت پر بٹھایا۔ ۱۸۰۵ء میں لارڈ لیک نے مرہٹوں کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کرلیا اور شاہ عالم کو تخت نشین رہنے دیا۔ اس کے بعد ۱۸۰۶ء سے ۱۸۳۷ء تک اکبر شاہ ثانی اور ۱۸۳۷ء سے ۱۸۵۷ء تک بہادر شاہ ظفر تخت دہلی پر مقیم رہے۔ اور بھی بہت سے حکمراں

ہوئے، جن میں سب سے آخر بہادر شاہ ظفر تھے۔

خودمختار ریاستیں:

اٹھارہویں صدی میں مغلیہ سلطنت کا جب زوال شروع ہوا تو جابجائی طاقتیں ظہور پزیر ہوئیں، مرہٹوں نے مغلوں کی اجڑی ہوئی شوکت پر اپنے محل بنائے، اور سارے مہاراشٹرا، گجرات اور مالوہ پر قبضہ جمالیا، ادھر نادر شاہ نے دلی کو لوٹا، خود مغلوں کے صوبیدار خودمختار بن گئے۔ بنگال میں علی وردی خان، اودھ میں برہان الملک، روہیل کھنڈ میں غلام قادر اور دکن میں نظام الملک خودمختار ہوگئے اور دلی کی اطاعت سے منھ موڑ لیا، خراج دینا بند کردیا، البتہ نام کو ابھی بھی شہنشاہ کا کلمہ پڑھتے تھے۔

مرہٹہ (مراٹھا) حکومت:

مرہٹہ سلطنت کا دارالسلطنت ''پونا'' (بمبئی) تھا، اس کا بانی شیواجی ہے، جس نے ۱۶۷۴ء سے ۱۶۸۰ء تک قیادت کی۔ اس کے خلاف ۱۶۶۶ء میں عالم گیر اورنگ زیب نے لشکر روانہ کیا، جس کے نتیجہ میں شیواجی اور اس کا بیٹا گرفتار ہوکر آگرہ میں نظر بند ہوئے۔ لیکن شیواجی فرار ہوکر پھر مہاراشٹرا پہنچ گیا اور دوبارہ قتل وغارت گری شروع کی۔ ۱۶۸۰ء میں شیواجی مرگیا تو اس کا بیٹا سنبھاجی جانشین ہوا، یہ بھی قتل وغارت گری میں مصروف ہوا، عالم گیر خود دکن پہونچا، سنبھاجی گرفتار ہوا، اور مارا گیا۔ اس کا بیٹا چھترپتی ساہو دہلی میں نظر بند ہوا۔ اس خاندان میں متعدد حکمراں ہوئے ہیں، جن میں تارابائی، راجارام چھترپتی، چھترپتی شاہوجی، راما راجہ غیرہ۔ یہ حکومت ۱۶۷۴ء سے ۱۸۱۸ء تک رہی، اپنے دورعروج میں یہ حکومت ہندوستان کے بڑے حصے جیسے سورت، گوالیر، اجمیر، اورنگ آباد، الہ آباد اور آگرہ ولاہور تک پھیلی ہوئی تھی۔ مراٹھا سلطنت کا عروج ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے زوال کا بڑا سبب سمجھا جاتا ہے۔

سلطنت آصفیہ دکن:

۱۷۲۴ء میں سلطنت آصفیہ دکن کی بنیاد میر قمرالدین نے رکھی اور اپنا لقب آصف جاہ

رکھا۔اس سلطنت کا قیام مغلیہ سلطنت کے لئے بہت بڑا دھچکہ تھا۔ یہ حکومت ۱۹۴۸ء تک قائم رہی، لیکن ۱۷۹۸ء کے بعد سے برطانوی حکومت کے زیر اثر رہی۔ البتہ داخلی انتظام نظام حیدآباد کے ہاتھوں میں تھا۔ان دوصدیوں میں یہاں سات نوابوں نے حکومت کی۔جن میں سے مظفر جنگ، میر فرقند، میر اکبر، میر محبوب، میر عثمان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ریاست اودھ:

اس ریاست کا بانی نواب سعادت علی ہے۔ یہ ۱۷۲۲ء میں اودھ کا صوبیدار تھا۔اس نے ۱۷۲۳ء میں برہان الملک لقب اختیار کیا اور خودمختار حاکم بن گیا۔ اس ریاست کا دارالسلطنت فیض آباد تھا۔ بعد میں یہ مقام لکھنو کو حاصل ہوا۔اس ریاست کے حکمرانوں میں صفدر جنگ، شجاع الدولہ، آصف الدولہ، بیگم حضرت محل وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ حکومت ۱۸۵۷ء تک کسی نہ کسی صورت میں برقرار رہی۔

ریاست بنگال:

اس ریاست کا قیام ۱۷۴۰ء میں ہوا۔علی وردی اس ریاست کا بانی ہے جو مذہبا شیعہ تھا، وہ یہاں کا صوبیدار تھا۔اس کا داماد زین الدین بہار کا حاکم تھا، زین الدین کا بیٹا سراج الدولہ علی وردی کا نواسہ تھا، وہ ۱۷۵۲ء میں سلطنت بنگال کا وارث ہوا، اس وقت اس کی عمر ۲۳ سال تھی۔اس کی حکومت کا دائرہ بہار، بنگال اور اڑیسہ تک تھا۔سراج الدولہ بہادر طبیعت کا مالک تھا، اس نے اپنے نانا کے ساتھ مل کر ۱۷۴۶ء میں مراٹھوں کو شکست فاش دی تھی۔انگریزوں نے سب سے پہلی اسی سلطنت پر قبضہ کیا تھا۔ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کے خلاف سازش رچی، چنانچہ فورٹ (قلعہ) ولیم کی دیواریں اونچی کیں، مجرم افسران کو پناہ دی، اور انگریز تو خود بھی کسٹم ڈیوٹی میں چوری کے مجرم تھے۔سراج الدولہ نے کچھ لوگوں کو گرفتار کرلیا تو مخالفت کی فضا قائم ہوگئی۔ چنانچہ انگریزوں نے اپنی فوجی قوت میں اضافہ کرنا شروع کردیا۔سراج الدولہ کے مخالفین جن میں فوجی سپہ سالار ''میر جعفر'' بھی تھا، ان لوگوں نے انگریزوں سے سازباز کرلی، چنانچہ ۱۷۵۷ء میں جب پلاسی کا معرکہ ہوا تو میر جعفر نے سراج الدولہ کے فوجیوں کو موت کے گھاٹ اتارنا شروع کردیا، جو تصور سے

باہر کی چیز تھی، چنانچہ سراج الدولہ کو شکست ہوئی۔ حسب وعدہ انگریزوں نے میر جعفر کو تخت نشین کیا، لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد اس غدار کو معزول کر کے میر قاسم کو اس کی جگہ بٹھا دیا۔

سلطنت میسور:

سلطنت میسور بھی خودمختار ریاست تھی۔ سلطان ٹیپو کا باپ حیدر علی راجہ میسور کا سپہ سالار تھا، جس نے میسور کو مرہٹا (مراٹھا) حکومت سے بچایا تھا۔ حیدر علی نے ۱۷٦٦ء میں راجہ میسور کے لئے وظیفہ مقرر کیا اور حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ حیدر علی نے پچاس سال تک انگریزوں کو روکے رکھا۔ ۱۷۸۴ء میں حیدر علی کی وفات کے بعد سلطان ٹیپو تاج وتخت کا مالک ہوا۔ نظام حیدرآبادی اور مراٹھوں نے ٹیپو کو اپنے لئے خطرہ محسوس کیا اور انگریزوں سے ساز باز کر لی، ٹیپو نے اپنی مدد کے لئے ترکی، فرانس، ایران اور افغانستان سے مدد چاہی، لیکن ناکام رہا، انگریزوں کو ٹیپو کی فوج کے اندر ''میر صادق'' ایسے غدار مل گئے۔ بالآخر یہ شیر ۱۷۹۹ء میں شہید ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

پنجاب حکومت:

احمد شاہ ابدالی کا پوتا شاہ زمان لاہور کا حاکم تھا، اس نے اپنی گدی پر راجہ رنجیت سنگھ کو بٹھا دیا تھا۔ ۱۷۹۹ء کو راجہ رنجیت سنگھ خودمختار ہو گیا۔ اس نے ۱۸۰۱ء-۱۸۳۹ء تک حکومت کی ہے۔ اس کا دارالحکومت لاہور تھا۔ ۱۸۲۰ء تک اس نے امرتسر، اٹک، ملتان، پشاور فتح کیا اور کشمیر تک جا پہنچا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا دلیپ، پھر شیر سنگھ حکمران ہوا۔ ۱۸۴۹ء میں انگریزوں نے اس حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اسی راجہ رنجیت سے حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے جہاد کیا تھا۔

نوابانِ اودھ کے زمانے میں پرتاپ گڑھ

۱۷۱۰ء میں بانی ریاست اودھ سعادت خان برہان الملک مانک پور کے فوجدار سربلند خان کے پاس ملازمت کے سلسلے میں آئے، سعادت خان کا اصلی نام محمد امین تھا، جو مذہبا شیعہ اور سادات نیسا پور خراسان سے تعلق رکھتے تھے۔ انہیں سربلند خان نے کیمپ کا نگراں بنادیا۔ یہ دونوں ۱۷/ مارچ ۱۷۱۲ء تک اپنے اپنے عہدوں پر فائز رہے، البتہ جب بہادر شاہ ابن عالمگیر کے لڑکے عظیم الشان کو، جو کہ سربلند خان کے مربی اور سرپرست تھے، جہاندار شاہ نے برادر کشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہزیمت سے دوچار کرنے کے بعد قتل کردیا، تو سربلند خان کی مداخلت کی وجہ سے ۱۷۱۲ء میں سعادت خان اپنے آقا سربلند خان کی معیت میں گجرات کے لئے روانہ ہوئے، جہاں سربلند خان کو نائب گورنر کا عہد تفویض ہوا۔

اب مانک پور کی فوجداری والا خالی عہدہ چھبیلہ رام نگر کے حوالہ ہوا۔ اس نے حکومت کو پورے ضلع میں وسعت دی۔ تاہم لگتا ہے کہ یہ کارروائی برائے نام ہی تھی۔ وجہ یہ ہے کہ علاقائی راجپوت سرداروں میں کھلبلی مچی ہوئی تھی، جن میں پرتاپ گڑھ کا سوم بنسی راجہ جئے سنگھ مضبوط اور طاقتور تھا، ایک قابل حاکم ہونے کے ساتھ تعلیم یافتہ، وضع دار، مسلمانوں کے رہن سہن اور اخلاق سے واقف تھا، وہ مسلمانوں کا لباس پہن کر محرم کے جلوس میں شرکت کرتا۔ اس کا انتقال ۱۷۱۹ء میں ہوا اور جانشین چھتر داری سنگھ ہوا۔ وہ پرتاپ گڑھ پر ۱۷۲۲ء تک آزادانہ حکومت کرتا رہا۔ جب محمد شاہ رنگیلے کے ذریعہ ۱۷۲۴ء میں برہان الملک سعادت خان کو اودھ کی صوبہ داری ملی تو اس نے علاقہ میں اپنی پوزیشن اتنی مستحکم کرلی کہ وہ اور اس کے وارث نام کے لئے تو سلطنت دہلی کے گورنر تھے، ورنہ بالذات اودھ کے مستقل نواب بن بیٹھے، اس طرح ۱۷۳۲ء میں خودمختار اودھ حکومت

کا قیام عمل میں آیا۔اس لحاظ سے پرتاب گڑھ کا تعلق اب سلطنت دہلی سے مکمل طور پر ختم ہوگیا، گوکہ نام کے لئے اب بھی یہ علاقہ صوبہ الہ آباد میں شامل رہا جوکہ سلطنت دہلی کے ماتحت تھا۔نوابان اودھ جنہیں نواب وزیر کہا جاتا تھا، یہ علاقہ اب مکمل طور پر ان کے زیر تحت ہوگیا، جس پر یکے بعد دیگرے وہ حکومت کرتے رہے۔(گزیٹئر)

پرتاپ گڑھ نواب اودھ کے عمل دخل میں:

ریاست اودھ کے قیام کے ابتداء سے ہی سعادت علی خان کی کوشش تھی کہ علاقہ کے مضبوط رجواڑوں کے راجاؤں کو مطیع اور فرمانبردار بنائیں، جو اپنی خود مختاری اور روایتی آزادی کے دلدادہ تھے اور اطاعت گزاری کے حوالہ سے سخت جاں واقع ہوئے تھے، اسی مقصد سے نواب سعادت علی خان نے پرتاپ گڑھ کے راجہ چھتر دھاری سنگھ کی آدھی سے زیادہ ریاست کو اپنے عمل دخل میں لے لیا۔

چھتر دھاری سنگھ کے پانچ لڑکے! دو بیویوں سے تھے، پہلی بیوی سے میدنی سنگھ، بدھ سنگھ، دلتھ سنگھ تھے، جبکہ دوسری بیوی سے دولڑکے پرتھی پاتھ سنگھ اور ہندو پاتھ سنگھ تھے، اس بیوی کا نام سوجان کماری تھا، جو شکل وصورت سے بڑی حسین وجمیل تھی۔

بڑے لڑکے میدنی سنگھ کو جب پتہ چلا کہ اس کی موروثی ریاست پر قبضہ کرلیا گیا ہے، تو وہ نواب اودھ سے انتقام کے لئے اٹھ کھڑا ہوا، چنانچہ اس مقصد سے اس نے رام پور دھاروپور کے مکھیا راج بھاؤ سنگھ (راجہ کالا کانکر) سے اتحاد کیا۔"رام پور، دھارو پور" یہ دونوں گاؤں اب کنڈا میں ہیں، پہلے یہ ریاست کالا کانکر کا حصہ تھے۔حکومت (اودھ) کی طرف سے کسی وقت معمولی باج گزاری کا مطالبہ اور اس کو آئینی وقانونی شکل دینے کا عمل اس اضطراب و بے چینی کا اصل سبب تھا۔لیکن انہیں ایام میں چھتر دھاری سنگھ اپنی دوسری بیوی سوجان کماری پر فریفتہ ہوکر اس کے پیٹ سے پیدا ہونے والے لڑکے پرتھی پاتھ سنگھ کو نہ صرف یہ کہ پرتاپ گڈھ ریاست کا گدی نشین قرار دیا، بلکہ ناانصافی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میدنی سنگھ کو اس کے پیدائشی حق سے بھی محروم کردیا۔میدنی سنگھ کو باپ کی اس ناانصافی سے ناگواری ہوئی، اور اس نے پرتاپ گڑھ کے متعدد میدانوں میں باپ سے

جنگ کی، مگر کامیاب نہ ہوا۔

۱۷۳۵ء میں چھتر دھاری سنگھ فالج کے مرض میں مبتلا ہو کر مر گیا اور پرتھی پاتھ سنگھ جانشین ہوا، یہ راجا ایک معاملہ فہم، لائق فوجی ہونے کے ساتھ مادری زبان ہندی کے علاوہ عربی، فارسی اور ترکی کا ماہر تھا، وہ روز مرہ گفتگو میں اتنی صاف فارسی بولتا کہ اس کے اور فارسی النسل کے درمیان فرق کرنا مشکل ہو جاتا۔ دفاعی قوت کو مضبوط کرنے کی غرض سے اس نے پرتاپ گڑھ قلعہ تعمیر کیا۔

راجہ کی مخاصمت اور انجام:

۱۷۳۹ء میں سعادت علی خان کا انتقال ہو گیا، اپنے بھتیجہ و داماد صفدر جنگ کو جانشین چھوڑا۔ صفدر جنگ ۱۷۳۹ء تا ۱۷۵۴ء برسر اقتدار رہا۔ طاقت کو اپنے ہاتھ میں یکجا کرنے کی غرض سے صفدر جنگ نے قومی حکومت، جس کے نظام سے متعدد عناصر لطف اندوز تھے اور ضلع میں ان کا دبدبہ تھا، اس کے زیر اختیار صوبہ الہ آباد کا انتظام بھی صفدر جنگ نے شہنشاہ دہلی سے حاصل کر لیا۔ لیکن نواب کے لئے اب بھی رام پور دھارو پور کا مکھیا راج بھاؤ سنگھ مسلسل دردسر بنا ہوا تھا۔ بھاؤ سنگھ نے ۱۷۴۸ء میں مانک پور کے فوجدار ''جئے رام نگر'' پر حملہ کر کے اسے قتل کر دیا۔ تو صفدر جنگ نے فوراً قلعہ رام پور کا محاصرہ کر لیا اور اس کو ریاست سے بے دخل کر دیا۔ اسی وقت بھدری کے راجہ دلجیت سنگھ نے بھی مانک پور کے ناظم مرزا جان سے لڑائی شروع کر دی، جس میں دلجیت مارا گیا اور اس کا لڑکا رائے ظالم سنگھ بھاگ نکلا۔ تاہم بعد کو واپس آ کر اسے اپنی ریاست سنبھالنے کی اجازت مل گئی تھی۔ صفدر جنگ نے مانک پور کی ذمہ داری اپنے وزیر، نگراں سپہ سالار راجہ کنول سنگھ کی سرپرستی میں جان نثار خان کے سپرد کر دی۔

۱۷۵۰ء میں احمد خان بنگاش جو فرخ آباد کے بنگاش کنبہ سے تعلق رکھتا تھا، اس کے اور صفدر جنگ کے درمیان رسہ کشی شروع ہو گئی۔ چنانچہ اسی سال اگست میں راجہ کنول سنگھ ایک جھڑپ کے دوران خداگنج (۶۲/کلو میٹر فرخ آباد کے جنوب مشرق) میں مارا گیا۔ اس کے بعد احمد خان بنگاش نے الہ آباد کی طرف کوچ کیا؛ جہاں اسے پرتھی پاتھ کی

طرف سے اتحاد کے لئے ایک دوستانہ دعوت نامہ موصول ہوا۔ ارائل الہ آباد ضلع میں فریق مخالف صفدر جنگ اور احمد خان بنگاش کے درمیان ہونے والی جنگ میں پرتھی پاتھ سنگھ نے حریف یعنی صفدر جنگ کی فوجوں کو ہزیمت سے دوچار کرنے کے لئے ایک سخت چوٹ ماری تھی۔ احمد خان بنگاش نے علی گڑھ میں کوئل کے قریب اپنے سپہ سالار سعدی خان کی مراٹھا اور صفدر جنگ کی متحدہ فوج کے ہاتھوں شکست کی خبر سننے اور یہ کہ متحدہ فوج اس کے دارالسلطنت فرخ آباد کی جانب بڑھ رہی ہیں، پرتھی پاتھ کے مشورہ کے برخلاف ۱۷۵۱ء میں الہ آباد کا محاصرہ ختم کر دیا۔ اور علاقہ سے کوچ کر گیا۔

اب صفدر جنگ نے اپنے بھتیجے مرزا محسن کے فرزند محمد قلی کو اودھ (فیض آباد) میں اپنا نائب مقرر کیا اور خود اپنی ریاست کے دورے پر روانہ ہوا، تاکہ راجہ کنول سنگھ کی موت کے بعد نظم ونسق کے ابتر ہونے، رعایا کے ایک طبقہ میں حکومت کے تئیں انتہائی غم وغصہ اور علی الاعلان بغاوت وسرکشی کے اسباب کا تدارک کرتے ہوئے پرتھی پاتھ سنگھ کو سبق سکھائے۔ اس مقصد سے صفدر جنگ نے سلطان پور (فیض آباد سے ۸۵ /کلومیٹر جنوب) یا گومتی کے کنارے پڑاؤ ڈالا، ایک دوستانہ خط ''پرتھی پاتھ سنگھ'' کو بھیجا، جس میں اسے کیمپ میں از خود حاضر ہونے کی دعوت دی تھی۔ نواب کے ارادہ کو مشتبہ جان کر اس نے حاضری سے انکار کر دیا۔ تو صفدر جنگ نے قسم کھا کر یقین دلایا کہ اس کی نیت بری نہیں ہے، نیز اس نے معافی کا وعدہ کیا اور یہ کہ اطاعت کی صورت میں اسے مانک پور کا فوجدار بنا دیا جائے گا۔ اس عہدے کی حرص راجہ کو پہلے ہی سے تھی، چنانچہ اس نے دعوت کو قبول کرلیا اور ۱۷۵۲ء کے ابتدائی دنوں میں کیمپ میں حاضری درج کرادی۔ دوران گفتگو صفدر جنگ نے اپنے محافظ خاص علی بیگ خان کھرجی کو اس کے قتل کا اشارہ کر دیا۔ سادہ لوح سپاہی علی بیگ کھرجی نے فوراً اپنے نیزہ کو پرتھی پاتھ سنگھ کے پیٹ میں بائیں جانب گھسا دیا۔ بے وہم وگماں غیر مسلح مقتول نے فوراً قاتل پر چھلانگ لگا کر قاتل کے رخسار کو نوچ لیا اور زمین پر گر کر مر گیا۔ پرتھی پاتھ سنگھ کا جانشین اس کا بارہ سالہ لڑکا ''دنیا پاتھ سنگھ'' ہوا۔ صفدر جنگ نے قلعہ پرتاپ گڑھ پر قبضہ کرلیا۔ (گزیٹئر)

محمد قلی خان حاکم مانک پور:

اکتوبر ۱۷۵۴ء میں صفدر جنگ مر گیا اور اس کے اکلوتے بیٹے شجاع الدولہ نے باپ کی جگہ لی، جو ۲۳ سال کا تھا، شجاع الدولہ کار حکومت و آئین جہانبانی سے لاپرواہ، ایک عیش و عشرت میں مست نوجوان تھا۔ اس کی بدکرداری و نالائقی کے باعث اس کے خلاف ہنگامہ برپا ہوا، جو اس کے چچازاد بھائی اور الہ آباد کے حاکم محمد قلی خان کے لئے مفید ثابت ہوا، محمد قلی خان نے شجاع الدولہ کو سلطنت اودھ سے بے دخل کرنے کی کوشش بھی کی، تاہم ناکام رہا۔ بہر صورت مانک پور سمیت الہ آباد پر محمد قلی خان کو حکومت کرنے کی اجازت رہی۔ گو کہ راج پوت سرداروں نے اسے اپنے عہدے پر کبھی سکون واطمینان سے رہنے نہیں دیا۔ اسی وجہ سے محمد قلی خان نے سرکار مانک پور کے لئے اپنا نائب نگراں محمد اسماعیل خان کو بنایا، سید فخر الدین کو پٹی و مانک پور کا فوجدار بنایا اور پرتاپ گڑھ میں نجف خان کو مقرر کیا۔ انہیں ایام میں شجاع الدولہ خود مانک پور آ کر محمد قلی خان کی فوج سے مل گیا، اس اقدام کا مقصد درحقیقت سلطنت دہلی کے وزیر امداد الملک کو نواب اودھ کے علاقوں پر قبضہ کرنے سے باز رکھنا تھا، چنانچہ یہ کوشش بار آور رہی۔

اس کے بعد محمد قلی خان کو ان باغیوں کی جانب متوجہ ہونے کا موقع ملا، جو تلوئی (رائے بریلی) کے راجہ بل بھدر سنگھ کی سرکردگی میں کام کر رہے تھے۔ اسی راجہ نے صفدر جنگ کے قبضہ کے بعد پرتاپ گڑھ کے قلعہ کو سوم بنسی راجپوتوں کے لئے آزاد کرایا تھا۔ اس مقصد سے محمد قلی خان نے نجف خان کو حکم بھیجا کہ بل بھدر سنگھ کو پرتاپ گڑھ سے بے دخل کر دے۔ مگر نجف خان راجپوتوں کو مکمل طور پر کچلنے میں نام رہا۔ اور مانک پور کے فوجدار سید فخر الدین کی لجاجت بھری التجا کے باوجود رائے بریلی میں موجود اپنے استاذ محمد قلی خان سے ملنے کے لئے پرتاپ گڑھ سے نکل گیا۔ اب راجپوتوں نے یہ دیکھ کر کہ سید فخر الدین تنہا فوج کی قیادت کر رہا ہے؛ مانک پور کا محاصرہ کر لیا اور فخر الدین کو پسپائی پر مجبور کر دیا۔ اس معرکہ میں سید فخر الدین نے بمشکل اپنی جان بچائی۔

اس خبر کو سننے کے بعد شجاع الدولہ نے خود راجپوتوں پر لشکر کشی کی اور انہیں پرتاپ

گڑھ سے بے دخل کر دیا۔ دنیا پاتھ سنگھ جو ۱۷۵۲ء میں بچ گیا تھا، شجاع الدولہ کے ہاتھ اس کے مقدر میں وہی تھا جو صفدر جنگ کے ہاتھ اس کے باپ پرتھی پاتھ سنگھ کے ساتھ ہوا تھا۔ چنانچہ ریاست پرتاپ گڑھ صوبہ اودھ کی تحویل میں چلی گئی۔

۱۷۵۹ء میں شجاع الدولہ نے محمد قلی خان کے علاقہ پر قبضہ کرلیا۔ اور راجپوتوں کی بقیہ فوج کو مانک پور سے بے دخل کر دیا۔ پھر سرکار مانک پور و پرتاپ گڑھ کو الہ آباد سے نکال کر اپنے قلمرو صوبہ اودھ میں شامل کرلیا۔ اس وقت سے یہ علاقہ صوبہ اودھ کا ایک محال ہوگیا۔ البتہ کچھ دنوں بعد پھر شجاع الدولہ نے ریاست پرتاپ گڑھ کو ہندو پاتھ سنگھ کے حوالہ کر دیا۔ یہ پرتھی پاتھ کا بھائی اور دنیا پاتھ کا چچا تھا۔ نواب نے اس حکم کو واپس لینے کا ایک مرتبہ ارادہ کیا، مگر مراٹھا فوجوں کی اودھ پر حملے کی وجہ سے باز رہا۔

مانک پور میں مراٹھا لشکر کی لوٹ گھسوٹ:

جولائی ۱۷۶۰ء میں شمالی ہند کے مراٹھا سپہ سالار ''سدا شیو راؤ بھاؤ'' نے الہ آباد علاقہ کے اپنے افسروں کو ہدایت دی کہ وہ اودھ کے زمینداروں کو اپنا ہمنوا بنائیں، نواب کے خلاف انہیں ورغلائیں اور اودھ میں انتقامی کارروائی کریں۔ جہان آباد اور کڑا کے مراٹھا فوجدار گوپال گنیش بروا اور کرشنانند پنت نے بالترتیب اودھ کے غدار سرداروں میں ممتاز ہندو پاتھ سنگھ پرتاپ گڑھ اور تلوئی رائے بریلی کے بل بھدر سنگھ سے خفیہ ساز باز کرلی، اور انہیں شجاع الدولہ کے خلاف کھلم کھلا بغاوت پر آمادہ کیا۔

جنوری ۱۷۶۱ء کے وسط میں کرشنانند دریائے گنگا کو عبور کر کے مانک پور پہونچ گیا۔ یہ ایک غارت گری اور لوٹ گھسوٹ تھی۔ بہت سے لوگ جو دریا کی طرف بھاگ کر اپنی جان بچانے کی کوشش کررہے تھے، ان کے سامانوں کو کشتی سے الٹ دیا گیا۔ وہاں کسی طرف سے کوئی مزاحمت نہ تھی، اس لئے مراٹھا لشکر اپنے نئے اتحادی ہندو پاتھ سنگھ کے ساتھ راستہ میں فائرنگ کرتے اور تلوار چمکاتے ہوئے ضلع کے اندر دیہات میں گھس آئے۔ پولیس اور خراج وصول کرنے والے کارندوں کو بھگا دیا۔ اس کے بعد اودھ کے دوسرے علاقوں میں غارت گری کے لئے آگے بڑھے۔

اس حملے کی اطلاع جب شجاع الدولہ کو ہوئی تو اس کے وزیر اور فوجی جنرل راجہ بینی بہادر نے فوراً پرتاپ گڑھ کا رخ کیا اور ان غارت گروں پر ٹوٹ پڑا۔ ہندو پاتھ اور پرتاپ گڑھ کے دوسرے راجپوت شکست کھا کر تتر بتر ہو گئے۔ اور کرشنا نند کو اودھ سے مجبوراً پسپائی اختیار کرنی پڑی۔ ہندو پاتھ کو مراٹھا لشکر سے اتحاد کی سزا یہ ملی کہ اس کو ریاست سے بے دخل کر کے گھاگھرا کی طرف جلاوطن کر دیا گیا۔

ہندو پاتھ سنگھ کا قبول اسلام:

کچھ دنوں بعد ہندو پاتھ سنگھ شجاع الدولہ کے پاس گیا، اپنے اسلام قبول کرنے اور سرفراز خان نام رکھنے کی اطلاع دی۔ اس طرح وہ دوبارہ اپنی ریاست حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ البتہ مذہب تبدیل کرنے کی وجہ سے خاندان والوں نے اسے قتل کر دیا۔

غالباً ۱۷۶۳ء میں شجاع الدولہ نے پرتاپ گڑھ میں اپنا ایک نائب متعین کیا، مگر پرتھی پاتھ سنگھ کا بھتیجہ سکندر شاہ نے سوم بنسی راجپوتوں کو یکجا کر کے پرتاپ گڑھ پر قبضہ کر لیا۔ اس کا قبضہ بمشکل چھ ماہ رہا ہو گا کہ نواب کے کارندوں نے انہیں کھدیڑ دیا۔

۱۷۶۸ء میں دنیا پاتھ سنگھ کا بھائی راجہ بہادر سنگھ جو کہ ریوا (مدھ پردیش) میں رہتا تھا، اس نے سخت لڑائی کے بعد نواب کے کارندوں سے قلعہ کو آزاد کرا لیا۔ بعد کو اس نے رام پور (پرتاپ گڑھ) کے تعلقہ دار بلوند سنگھ کے ہمراہ نواب کے لشکر سے لڑائی کی اور شکست سے دوچار ہوا۔ پھر قلعہ پرتاپ گڑھ نواب کی عملداری میں آنے تک ناظم کے ہاتھ رہا۔

پرتاپ گڑھ میں نواب کی فوجی چھاؤنی:

۱۷۷۵ء میں شجاع الدولہ مر گیا، اور اس کا لڑکا آصف الدولہ تخت نشین ہوا، اس نے کنپور یا تعلقہ دار جھام سنگھ کو معزول کر کے اٹھیہا (تحصیل پرتاپ گڑھ) کو اپنی والدہ بہو بیگم کے حوالہ کر دیا۔ آصف الدولہ نے پرتاپ گڑھ کو چکالہ اور ایک ہزار پیادہ فوجیوں کا ہیڈ کوارٹر بنا دیا۔ دو توپ اور گھوڑ سواروں کا ایک دستہ تعینات کر دیا۔

مانک پور کی آبرو پر آصف الدولہ کا حملہ:

آصف الدولہ ایک زبردست معمار تھا، اس نے چوکا پور (مانک پور) میں موجود محل نما

عمارتوں کے عمدہ نقش ونگار والے پتھروں کو بڑے امام باڑہ کی تزئین کے لئے لکھنو منتقل کرلیا۔ یہ عمارتیں نواب عبدالصمد گردیزی نے عہد اکبری میں تعمیر کرائیں تھیں۔ آصف الدولہ نے کنڈہ تحصیل کے گاؤں مراساپور میں مٹی کا ایک قلعہ بھی تعمیر کرایا۔

بعد کی نصف صدی کی پوری تاریخ تقریباً اسی طرح ہے کہ اودھ حکومت کے کارندوں اور علاقائی راجپوت سرداروں کے مابین لڑائی چلتی رہی ہے۔

۱۷۹۶ء میں صیف آباد پٹی کے بجگوٹی مکھیا زبرسنگھ نے پرتاپ گڑھ کے چکلا دار راجہ ہلاس رائے سے شمشیر بازی کی اور اپنے قلعہ جۓ سنگھ گڑھ میں شکست سے دوچار ہوا۔

۱۷۹۷ء میں راجہ بھوانی پرساد ایک سال کے لئے پرتاپ گڑھ میں ناظم رہا۔ اسے بھی تحصیل پٹی کے سونپوریا، راجپوتوں کی طرف سے دشواریوں کا سامنا رہا۔

۱۷۹۷ء میں آصف الدولہ کا انتقال ہوگیا، اور جانشین اس کا لڑکا وزیر علی خان ہوا۔ لیکن اس کے چچا سعادت علی خان نے اس کی تخت نشینی کو اس بنیاد پر چیلنج کردیا کہ وہ آصف الدولہ کی ناجائز اولاد ہے۔ سعادت علی خان کو اپنے دعوی میں کامیابی ملی، اور جنوری ۱۷۹۸ء میں وہ نواب اودھ کے منصب پر فائز ہوگیا۔

۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۶ء تک یہ علاقہ، سلطان پور میں نواب اودھ کے متعین کردہ ناظم کے عمل دخل میں رہا۔

راجہ بھدری کی گرفتاری:

۱۸۱۰ء میں بھدری بیسن راجپوت رائۓ ظالم سنگھ نے نواب کے عہدے داروں کو خراج دینے سے انکار کردیا۔ اس کی وجہ سے اسے گرفتار کرکے لکھنو بھیج دیا گیا۔ اور اس کی ریاست براہ راست اودھ حکومت کی تحویل میں دیدی گئی۔ اس کی عدم موجودگی میں اس کی بیوی ''شیوراج کنواری'' نے مذہبی رسوم کی ادائیگی کے بہانے بھدری کے قلعہ میں داخل ہونے کا بندوبست کیا۔ اس دوران وہاں دیگر بیسن راجپوت بھی جمع ہوگئے۔ اور کاشتکاروں سے خراج وصول کیا۔ تعلقہ دار جگت کشور نے ان کو قلعہ میں گھیر کر دھاوا بول دیا، یہ یورش آٹھ روز تک جاری رہی، تا آں کہ لکھنو سے حملہ روکنے کا حکم آ گیا۔ اور اس

عورت کو قلعہ پر قبضہ کی اجازت مل گئی۔سعادت علی خان کے لڑکے غازی الدین حیدر کی تخت نشینی کے ایک سال بعد ۱۸۱۴ء میں رائے ظالم کو قید سے رہائی ملی، اور اپنی ریاست میں پھر سے تصرف کی اجازت بھی مل گئی۔

غلام حسین پیشکار نواب اودھ:

انیسویں صدی کے ابتدائی زمانہ میں غلام حسین نامی شخص جو گاؤں ملکا پور پرگنہ بہار ضلع پرتاپ گڑھ کا رہنے والا تھا؛ سعادت علی خان کے پاس ملازمت کے لئے گیا اور اس کے گھوڑوں کا نگراں مقرر ہوا۔اس نواب یعنی غازی الدین حیدر کی طرف سے اس پر مزید عنایتیں ونوازشیں ہوئیں اور نواب کے گھر بار کا پیشکار بن گیا۔قریباً ۱۸۲۰ء میں رائے پور بچور (پرتاپ گڑھ) کے راجپوتوں نے رائے پرتھی پال کی سرکردگی میں وہاں کے قانون گو کو ہلاک کر دیا۔اس پر نواب اودھ نے غلام حسین ناظم کو پرتھی پال پر حملے کا حکم کر دیا، چنانچہ ناظم نے بچگوٹیوں کو رائے پور بچور میں ان کے قلعہ کے اندر محصور کر دیا۔ ۱۹/انیس دن کی مزاحمت کے بعد پرتھی پاتھ سنگھ نکل بھاگا اور رائے پور بچور براہ راست حکومت اودھ کے عمل دخل میں آ گیا۔۱۸۲۵ء میں دوبارہ پھر سے بچگوٹی مکھیا کو اس کی ریاست مل گئی۔

۱۸۲۷ء میں نواب غازی الدین حیدر کا انتقال ہو گیا اور اس کا لڑکا نصیر الدین حیدر جانشین ہوا۔اس کا دور اقتدار ۱۸۲۷ء سے ۱۸۳۷ء تک رہا۔اس نے غلام حسین کی وہ دولت ضبط کر لی جو اس نے گزشتہ نواب کے زمانہ میں عہدۂ پیشکاری کے دوران جمع کی تھی۔نواب نصیر الدین حیدر کو بھی خاص کر بھدری کے بیسن راجپوتوں کی طرف سے بغاوت کا سامنا رہا۔ ۱۸۳۳ء میں ظالم سنگھ کے لڑکے جگموہن سنگھ کی قیادت میں ان راجپوتوں نے خراج میں اضافی رقم، جس کا مطالبہ احسان خان ناظم کی طرف سے تھا، دینے سے انکار کر دیا۔اسی طرح کا مطالبہ احسان خان ناظم نے رام پور دھارو پور (کالا کانکر) سے بھی کیا تھا۔اس نے انکار کیا تو جنگ ہوئی، جس میں احسان کو شکست ہوئی، دو توپوں کا نقصان بھی ہوا۔راجہ بینتی کے ساتھ بھی جنگ ہوئی، اور نتیجہ اسی قسم کا رہا۔تاہم یہ تمام شکستیں راجپوتوں

کو سبق سکھانے کی بابت احسان خان کے عزم وارادہ کو کمزور نہ کرسکیں، چنانچہ اس نے ایک لشکر جررا تیار کیا اور راجہ بھدری کو دوسری مرتبہ اس کے قلعہ میں گھیر لیا، راجہ جگموہن اور اس کالڑکا گنگا کے راستے بھاگ کر الہ آباد کی طرف چلے گئے، جو اس وقت برطانوی حکومت کے زیر قبضہ تھا۔ احسان خاں نے پیچھا کیا اور وہاں جا کر انہیں قتل کر دیا۔ برطانوی حکمرانوں کو یہ بات بہت گراں گزری۔ اورانھوں نے احسان کو اس کے عہدے سے برخواست کروادیا۔

قلعہ کالا کانکر کی تعمیر:

۱۸۳۷ء میں نصیر الدین حیدر مر گیا، اس کا بیٹا تخت حکومت پر بیٹھا، اور ۱۸۴۲ء میں اپنی موت تک اس عہدہ پر برقرار رہا۔ اسی نواب کے عہد حکومت میں راجہ ہنونت سنگھ نے کالا کانکر میں گنگا کے کنارے اپنا قلعہ تعمیر کرایا، یہ قلعہ آبی گزرگاہ سے گھرا ہوا ہے، چنانچہ گنگا کا (ہندوؤں کے نزدیک مقدس) پانی یہاں ہمہ وقت میسر ہے، علاوہ اس کے دفاعی پوزیشن کا استحکام بھی اس طرز تعمیر کا مقصد رہا ہوگا۔

امجد علی شاہ ۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۷ء آخری نواب واجد علی شاہ سے پہلے تھا، اس کے دور حکومت میں چھترپال گڑھ کے مقامی راجپوت مکھیا نے شہرت حاصل کی اور نواب کی طرف سے اسے پرتاپ گڑھ کے بارہ گاؤں عنایت ہوئے۔

کالا کانکر کے ہنونت سنگھ کو راجہ کا خطاب:

واجد علی شاہ ۱۸۴۷ء تا ۱۸۵۶ء اودھ حکومت کا آخری نواب تھا۔ اس نے ۱۸۵۹ء میں ''کالا کانکر'' کے ہنونت سنگھ کو راجہ کا خطاب دیا۔ یہ راجہ لڑائی میں ہمیشہ ناظم کے ساتھ رہا کرتا۔ ۱۸۵۳ء میں ہنونت سنگھ کو بھی حکومت کے خلاف بغاوت کی وجہ سے ناظم نے ''کالا کانکر'' کے قلعہ میں گھیر لیا تھا، چھ سات روز تک مقابلہ کے بعد ہنونت سنگھ نے قلعہ کو چھوڑ کر ''سجھا کر'' جنگل میں پناہ لی۔

فروری ۱۸۵۶ء میں ایست انڈیا کمپنی نے واجد علی شاہ کو معزول کر کے ریاست اودھ کو اپنے عمل دخل میں لے لیا۔ اس کے بعد پرتاپ گڑھ کو ایک ضلع بنا دیا گیا، جس کے

مرکزی دفاتر ’’بیلہا‘‘ میں تعمیر کئے گئے۔انگریزں نے مال گذاری کے سخت قوانین نافذ کئے، جس کی وجہ سے زمینداروں اور تعلقہ داروں کو سخت پریشانی کا سامنا ہوا۔ چنانچہ ’’کالا کانکر‘‘ کے ہنونت سنگھ کو انگریزوں نے ان کی جائیداد کے اکثر حصوں سے معزول کردیا تھا۔ بغاوت کے زمانہ میں انھوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا، بھاگنے والے انگریز عہدیداروں کے جان و مال کی حفاظت اپنے قلعہ میں کی۔لیکن ہر طرف سے انگریزوں کی مخالفت شروع ہوئی، اور تمام تعلقہ داروں اور زمینداروں نے انگریزوں سے تعلقات ختم کرکے، انگریزوں کی مخالفت شروع کردی تو ہنونت سنگھ بھی انگریزوں کے سخت دشمن ہوگئے۔ چنانچہ انگریزی اقتدار جتنی سرعت سے آیا تھا، اسی طرح ختم بھی ہوگیا۔

برٹش افسران کے بھاگنے کے بعد یہ علاقہ سلطان پور کے ناظم مہدی حسین کی تحویل میں آگیا، اور انھوں نے انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ چنانچہ دسمبر ۱۸۵۸ء میں مجاہدین آزادی نے الہ آباد تا فیض آباد پورے علاقہ پر قبضہ کرلیا۔ان لوگوں کی قیادت مہدی حسین کے نائب فضل عظیم کررہے تھے۔تمام لوگ ’’ سُراؤں‘‘ یں جمع ہوئے۔ ۱۸۵۸ء میں برٹش کمانڈر برگیڈیئر برکیلی نے گنگا عبور کرکے پرتاپ گڑھ کا رخ کیا، مجاہدین آزادی دہیاواں گاؤں میں جمع تھے۔سخت مقابلہ ہوا، انگریزوں کو غلبہ ہوا اور ۵۰۰/ پانچ سو مجاہدین آزادی مارے گئے۔اس طرح ظلم وستم کی سیاہ تاریخ لکھتے ہوئے انگریزوں نے تمام علاقوں پر قبضہ کرلیا۔

انگریزی حکومت اور تحریک آزادی

انگریز، عیسائی تھے۔ عیسائی لوگ اپنے تاریک دور میں اس وجہ سے سمندری سفر سے بچتے تھے کہ زمین گول ہے، زیادہ دور جانے سے کہیں وہ اتھاہ ''خلا'' میں نہ گر پڑیں۔ مگر اندلس (اسپین) جہاں مشہور اسلامی حکومت تھی اور جس کے زیر تحت بڑی بڑی تعلیم گاہیں تھیں، وہاں یورپ کے لوگ حصول علم کے لئے آتے تھے۔ یہ طلبہ جب اپنے ملکوں کو گئے تو انھوں نے اس طرح کے غلط نظریات کی تردید کی۔ چنانچہ سلاطین ترکی نے اہل یورپ سے جنگ کے زمانے میں جب حلب، اسکندریہ اور قطیف جیسے بازاروں کے دروازے بند کردئے، تو انہیں گرم مسالحہ جات، کپڑوں اور دیگر ضروریات کے لئے دیگر منڈیوں کی تلاش ہوئی۔ اس سلسلے میں انھوں نے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کئے۔ اندلس پر اس وقت عیسائیوں کا قبضہ ہو چکا تھا، شہزادہ ہینری آف نیویر کے حکم سے واسکوڈی گاما ایک طویل سمندری سفر پر ہندوستان آپہنچا۔ یہ دریافت ان کے لئے سونے کی چڑیا تھی، چنانچہ ان لوگوں نے اس سے نفع اٹھانا شروع کیا اور پرتگیزی جہاز ہندوستانی ساحلوں پر آنے جانے لگے۔ ہالینڈ اور برطانیہ والوں کو خبر لگی تو ان لوگوں نے مشرقی تجارت میں حصہ دار بننے کی جدوجہد کی، چنانچہ اس کے لئے لڑائیاں ہوئیں، خون خرابے ہوئے، آخرکار پرتگال اور ہالینڈ کا آفتاب ڈوب گیا اور میدان میں صرف دو پہلوان یعنی برطانیہ اور فرانس رہ گئے۔

تجارتی کوٹھیاں اور بحری برتری:

جہانگیر کے عہد حکومت: ۱۶۰۱ء میں برطانیہ کا سب سے پہلا تجارتی قافلہ ہندوستان

آیا اوراس سفر میں انہیں گمان سے کہیں زیادہ نفع ہوا۔ ۱۶۰۸ء میں سرطامس کی سرکردگی میں ان کا دوسرا سفر ہوا، اس وقت اس نے جہانگیر پر کچھ ایسا جادو کیا کہ اس نے انگریزوں کو ہندوستان میں جگہ جگہ اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کرنے کی اجازت دیدی۔ چنانچہ سورت، احمد آباد، کھمبات، آگرہ اور اجمیر میں ان کی تجارتی کوٹھیاں قائم ہوگئیں۔ سمندر میں دوران سفر انہیں عرب ملاحوں نیز انگریزی قوم کے بحری قذاقوں سے واسطہ پڑتا تھا، اس کی وجہ سے ان کے جہاز توپوں سے مسلح رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ یہ اتنے مضبوط ہوگئے کہ نہ صرف عرب تاجر اور ملاحوں کو بلکہ خود ہندی سلاطین کو اہل یورپ کی بحری برتری کا تجربہ ہوا۔ لیکن مغلوں کو شاید اس کا احساس نہ ہوا کہ یہ کمزوری ایک دن ہندوستان کو غیروں کا غلام بنا دے گی۔

سیاست میں انگریزی عمل دخل:

کرناٹک کے مشرقی ساحل پر انگریزی اور فرانسیسی دونوں موجود تھے۔ مدراس اور پانڈیچری ان کا صدر مقام تھا۔ جس کا گورنر ڈوپلے نامی ایک فرانسیسی شخص تھا۔ کرناٹک کا صوبہ آزاد ریاست بن گیا اور کہنے کے لئے نظام دکن کے ماتحت رہا، اس وقت نظام الملک کے تخت اور کرناٹک کی صوبہ داری کے دو دعویدار اٹھے۔ ایک فریق سے فرانسیسی گورنر ڈوپلے نے دوستی کی تو دوسرے دعویدار سے انگریزوں نے۔ لڑائی میں انگریزں کے پٹھو محمد علی کو فتح ملی۔ اس کی وجہ سے انگریزوں کے حوصلے بلند ہوگئے۔ اس کے بعد جنگ پلاسی ہوئی، جس میں انگریزوں نے سراج الدولہ کو شکست دے کر بنگال، اڑیسہ اور بہار پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد سلطان ٹیپو کو شکست دی، پھر کیا تھا، مڑاٹھوں اور پنجاب کے حکمرانوں کو شکست دے کر انگریزوں نے تقریباً پورے ملک پر قبضہ کرلیا۔ تاہم دہلی کے مغلیہ شہنشاہ کو تخت نشین رہنے دیا اور ان کے لئے وظیفہ متعین کردیا۔

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ:

انگریزی اقتدار جہاں جہاں بھی ہوا، ان لوگوں نے ہندوستانیوں کی تذلیل اور ملک کو لوٹنے گھسوٹنے میں کوئی کمی نہ کی۔ ان سے پہلے بھی یہاں افغانوں، ترکوں اور عربوں

نے حملے کئے اور حکومتیں کیں، لیکن ان لوگوں نے یہاں کی دولت کہیں دوسری جگہ منتقل نہیں کی، بلکہ انھوں نے یہیں شادی بیاہ اور رشتے کئے، اور یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ نے لکھا ہے: ''محمد شاہ تغلق اپنے ملک سے باہر روپیہ لیجانے کی کبھی اجازت نہیں دیتا تھا اور مشہور تھا کہ اگر کوئی شخص کبھی لے جاتا تو ضرور کسی نہ کسی مصیبت میں پڑ جاتا۔'' (رحلہ ابن بطوطہ: ۴۶۴/ ۲) اس کا اثر یہ تھا کہ ملک نہایت خوشحال تھا۔

انگریزوں کا معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا، وہ یہاں کی دولت لوٹ گھسوٹ کر برطانیہ بھیجتے تھے۔ تجارت پر اتنا بھاری ٹیکس نافذ کیا کہ کاروبار ختم ہوگئے۔ زمین پر اتنی زیادہ لگان لگادی کہ لوگ زمین اور کاشتکاری سے بھاگنے لگے۔ ہندوستانیوں پر اعلی ملازمتوں کے دروازے بند کردئے گئے۔

میلکم لوئین جج عدالت العالیہ مدراس نے لندن کے ایک رسالہ میں لکھا: ہم نے ہندوستانیوں کی ذاتوں کو ذلیل کیا، ان کے قانون وراثت کو منسوخ کیا۔ بیاہ شادی کے قاعدوں کو بدل دیا۔ مذہبی رسم ورواج کی توہین کی۔ عبادت خانوں کی جاگیریں ضبط کرلیں۔ سرکاری کاغذات میں انہیں کافر لکھا۔ امراء کی ریاستیں ضبط کیں۔ لوٹ گھسوٹ سے ملک کو تباہ کیا۔ انہیں تکلیف دے کر مالگذاری وصول کی۔ سب سے اونچے خاندانوں کو برباد کرکے انہیں آوارہ گرد بنادینے والے بندوبست کئے۔

سرسید خان نے اسباب بغاوت ہند میں لکھا ہے کہ: پادری لوگ پولیس کانسٹبلوں کو ساتھ لے کر مسلمانوں کے وعظوں اور ہندوؤں کے کتھاؤں میں جاکر اعتراضات کرتے تھے اور مذہبی پیشواؤں کی برائی اور ہتک کرتے تھے، جس سے لوگوں کو دلی تکلیف پہونچی تھی، اس طرح چند قوانین جاری کئے گئے جن سے مذہب میں مداخلت ہوتی تھی، حتی کہ ہندو مسلمان سپاہیوں کو چربی کے کارتوس کاٹنے میں پر مجبور کیا جس سے ہنگامہ ہوا۔

انہیں ایام میں ان لوگوں نے اودھ حکومت کا الحاق کرلیا۔ مختصر یہ کہ ان واقعات نے تمام ملک کو ناراض اور پریشان کردیا۔ اور انہیں ہنگامہ کرنے پر مجبور کردیا۔ چنانچہ کلکتہ، انبالہ، لکھنو، میرٹھ میں ہندوستانی سپاہیوں نے چربی والے کارتوس استعمال کرنے کی بابت

اپنے افسران کے حکم کی خلاف ورزی کی، اس پر ان فوجیوں کو سزا دی گئی اور انہیں حوالات میں بند کردیا گیا۔ میرٹھ میں ہندوستانی فوج نے چند انگریز افسروں کو مار کر حوالات توڑ دیئے اور قیدی سپاہیوں کو رہا کرا کے سیدھے دہلی چل دئے، جو میرٹھ سے چالیس میل ہے۔ دہلی پہونچنے پر وہاں کی فوج ان سپاہیوں کے ساتھ ہوگئی اور دوسرے دن ۱۱رمئی، ۱۸۵۷ء کو یہ لوگ زبردستی قلعہ میں گھس گئے، اور بہادر شاہ ظفر کو سردار بننے پر مجبور کردیا۔ بہادر شاہ ظفر ان لوگوں کے ساتھ ہولئے، چنانچہ دہلی پر ان لوگوں کا قبضہ ہوگیا۔ (مسلمانوں کا روشن مستقبل، از: طفیل علیگ)

یہ خبر تمام ملک میں پھیل گئی، اور ہر طرف سے ہنگامے ہونے لگے۔ فیروز پور پنجاب کے سپاہیوں نے بغاوت کی۔ اودھ، روہیل کھنڈ، دوآبہ انگریزوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ یہی حالت بندیل کھنڈ، باندہ، جھانسی اور کالپی کی ہوئی۔ جن لوگوں نے اس بغاوت میں حصہ لیا ان میں نمایاں نام یہ ہیں:

(۱) تھانہ بھون میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، حضرت مولانا قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت حافظ ضامن شہید رحمہم اللہ وغیرہ نے حصہ لیا اور تھانہ بھون کا انتظام وانصرام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ حضرت حافظ ضامن رحمۃ اللہ علیہ اس معرکہ میں شہید ہوگئے تھے۔ (۲) جنرل بخت خان ''سپہ سالار'' خان بہادر روہیلہ چودہ ہزار سپاہ کے ساتھ دہلی پہونچنے، بادشاہ نے انہیں دہلی کا سپہ سالار مقرر کیا۔ (۳) شہزادہ فیروز شاہ جو شاہی خاندان دہلی سے تھے۔ (۴) مولوی احمد شاہ یہ فیض آباد کے مشہور عالم تھے۔ (۵) حضرت محل بیگم نواب واجد علی، انھوں نے دس ماہ تک انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ مولانا احمد شاہ کو اپنے لشکر کا سپہ سالار مقرر کیا تھا۔ (۶) خان بہادر نواب روہیل کھنڈ (مرادآباد واطرف) کے آخری تاجدار تھے۔ (۷) تانتیا ٹوپی نے کالپی میں حصہ لیا۔ (۸) مہاراجہ ٹھہو رعرف نانا صاحب مرہٹہ، انھوں نے کانپور میں حصہ لیا، سبز جھنڈا لگا کر بہادر شاہ ظفر کے نام کی ایک سو ایک توپوں سے سلامی دی۔ (۹) جھانسی کی رانی نے کمپنی کی فوج پر قبضہ کر کے شہنشاہ دہلی کا پرچم لگایا اور انگریزوں سے بہادری کے ساتھ لڑی۔

(۱۰) راجہ کنور سنگھ جگدیش پور صوبہ بہار، انھوں نے انقلابی فوج کا سردار بن کر آرہ کے خزانہ پر قبضہ کرلیا تھا۔

انگریزی مظالم:

لیکن انگریزوں نے پنجابیوں، گورکھوں اور رئیسوں کی مدد سے اس ہنگامہ پر قابو پالیا، اس کے بعد انھوں نے ہندوستانیوں پر جس قسم کے مظالم ڈھائے، وہ ناقابل بیان ہیں، ان مظالم کی شدت کو خود انگریز مورخوں نے تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ ''ہومز'' نے لکھا ہے: ''بوڑھے آدمیوں نے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا، ان سے اور بیکس عورتوں سے جن کی گود میں دودھ پیتے بچے تھے، ہم نے اسی طرح بدلہ لیا، جس طرح بڑے بڑے باغیوں سے''۔

مورخ ''کئ'' تسلیم کرتا ہے: ''تنہا الہ آباد کے علاقہ میں ''نیل'' نے اتنے ہندوستانیوں کو مروا ڈالا جتنے انگریز مرد وعورت اور بچے بوڑھے ۵۸ / ۱۸۵۷ء کے سارے ہنگامے میں انقلابیوں کے ہاتھ سے نہیں مرے تھے''۔

ایک انگریز افسر لکھتا ہے: انبالہ سے دلی تک ہزاروں بے قصور دیہاتیوں کو انگریزوں نے قتل کر ڈالا، ان کے بدنوں کو سنگینوں سے چھیدا جاتا تھا۔

طامس نے لکھا ہے: دہلی کے مسلمانوں کو ننگا کر کے اور زمین سے باندھ کر سر سے پاؤں تک جلتے ہوئے تانبہ کے ٹکڑوں سے اچھی طرح داغ دیا جاتا اور مسلمانوں کو سوروں کی کھالوں سے سی دیا جاتا۔ دہلی کے تمام لوگوں کے مکانوں کو لوٹ کر انہیں شہر سے نکال دیا گیا۔ (مسلمانوں کا روشن مستقبل)

تحریک آزادی:

ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا زوال اور اس کے بعد ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ناکامی بہت بڑا سانحہ تھا۔ غیر منقسم ہندوستان پر اس کے بدترین اثرات مرتب ہوئے، اور مسلم قوم جس سے اقتدار چھینا گیا تھا؛ ان میں مایوسی اور ناامیدی کی ایسی فضا پیدا ہوئی جس میں زندگی کی روشنی سے محرومی انسان کو مستقبل کی تعمیر کے تصور سے محروم کر دیتی ہے۔ اب

مسلمانوں کو ازسرنو حالات کا جائزہ لینے اور گزشتہ واقعات سے عبرت حاصل کرنے اور مستقبل کے لئے ایسے لائحہ عمل کی حاجت ہوئی، جس میں ان کے وجود و بقا کی ضمانت نیز عظمت رفتہ کی بحالی کا امکان ہو۔

چوں کہ ۱۸۵۷ء کے حالات یکا یک پیش نہیں آئے تھے، بلکہ یہ دراصل نتائج تھے ان علمی، فکری، دینی اور اخلاقی کمزوریوں کے، جو عالمگیر اورنگ زیب کے بعد مسلمانوں میں پیدا ہوئیں تھیں۔ ورنہ اورنگ زیب کے زمانے میں پورے برصغیر پر انتہائی شان وشوکت کے ساتھ اسلامی پرچم لہرا رہا تھا۔ آخر ایسے حالات کیا پیش آئے کہ دیکھتے دیکھتے سلطنت مغلیہ کا چمکتا دمکتا سورج غروب ہو گیا۔ ان حالات پر دراصل غور کی ضرورت ہوئی۔

قوموں کے عروج وزوال میں جو اسباب کارفرما ہوتے ہیں، وہی اسباب درحقیقت یہاں بھی تھے۔ اقبال مرحوم نے خوب حقیقت کی ترجمانی کی ہے:

آ! تجھ کو بتادوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر وسناں اول طاؤس ورباب آخر

اقبال ہی کا یہ شعر بھی ہے:

قوت فکر وعمل پہلے فنا ہوتی ہے
پھر کسی قوم کی شوکت پہ زوال آتا ہے

مسلسل حکمرانی اور عیش وآرام کی وجہ سے مسلمان بزدل اور کم ہمت ہو گئے تھے۔ راحت وآرام طلبی کی وجہ سے جدوجہد اور محنت ومشقت کے کاموں سے جی چرانے لگے۔ علمی میدان سر کرنے اور فکری وعملی جد جہد سے ان کی ہمتیں جواب دے چکی تھیں۔ جسمانی راحت اور ذہنی تعیش کے دلدادہ ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ سب سے زیادہ نقصان اس مشن نے پہنچایا تھا جو ہمایوں کے ساتھ ایران سے آیا تھا، یہ مشن سب سے بڑا ناسور ثابت ہوا۔ اس کی وجہ سے عقیدہ توحید اور دین وایمان میں بگاڑ آچکا تھا، سنت کی جگہ بدعت نے لے لی اور عبادت کی جگہ رسوم نے۔ قرآن وسنت کو چھوڑ کر دیگر کتابوں میں انہماک بڑھ گیا۔ حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ جو عہد مغلیہ کے آخری

دور کے لوگوں میں ہیں، انھوں نے ان امراض کی تشخیص بہت پہلے کردی تھی اوران کی اصلاح کے لئے تابمقدر کوششیں بھی کیں، انھوں نے اس سلسلے میں کتابیں لکھیں اور رجال تیار کئے۔ یہ تحریک ولی اللہی ہی تھی، جو سید احمدؒ رائے بریلوی اور اسماعیل شہیدؒ وغیرہ کی قیادت میں پھلی پھولی۔ نیز آگے چل کر اسی کی بنیاد پر دارالعلوم دیوبند قائم ہوا۔ اسی تحریک کے لوگوں کو وہابی کہہ کر بدنام کیا گیا اوران کے کفر کے فتوی دئے گئے۔

شاہ عبدالعزیز:

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے جانشین شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے دہلی پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت قائم ہونے کے بعد ایک تفصیلی فتوی جاری کر کے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا اعلان کیا۔ یہی فتوی ہندوستان کی جدوجہد آزادی کا نقطہ آغاز ہے، جس نے درمندان ملت کے دل میں یہ امنگ پیدا کی کہ اب مادر وطن میں اسلام اور دین کی حفاظت کے لئے سفید فام انگریزوں سے ٹکر لینا لازمی ہے۔ (مقدمہ تحریک شیخ الہند)

۱۸۰۸ء میں مہاراجہ جسونت راؤ ہلکر اوران کے منہ بولے بھائی امیر علی خان نے جب انگریزوں کے خلاف متحدہ محاذ قائم کیا تو شاہ عبدالعزیز کے مرید خاص اور معتقد حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی امیر خان کی فوج میں شامل ہوئے۔ مگر ان لوگوں نے انگریزوں سے صلح کا ارادہ کیا تو سید صاحب دہلی واپس آ گئے، آپ وہاں کل سات سال رہے تھے۔

سید احمد شہید:

دہلی واپسی کے ساتھ ہی آپ کی یہ تحریک اپنے دوسرے دور میں داخل ہوتی ہے۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے گھرانے کے لوگ آپ سے بیعت ہوئے اور خود شاہ صاحب نے آپ کے سر پر اپنی سیاہ دستار رکھی اور اپنا استعمال شدہ سفید کرتا مرحمت فرمایا۔ ۱۸۱۸ء میں یہ لوگ سہارنپور، مظفر نگر اور میرٹھ وغیرہ کے اصلاحی دورے پر روانہ ہوئے۔ اس کے بعد رام پور، بانس بریلی ہوتے ہوئے رائے بریلی وطن کے لئے روانہ ہوئے۔ وطن میں دو برس قیام کیا اور اطراف وجوانب کے دورے کئے اور خلق خدا کو راہ راست پر

لے آئے۔اپنے وطن میں نکاح بیوگان کی سب سے پہلی مثال آپ نے خود قائم کی۔رائے بریلی کے اثنائے قیام (۱۸۱۹ء) میں،قصبہ نصیرآباد(ضلع رائے بریلی) میں یہ واقعہ پیش آیا کہ وہاں کئی سنی گھرانے شیعہ ہوگئے۔اوراس سال وہاں جلوس وتبرا کے موقع پر شیعہ سنی اختلاف رونما ہوا۔سنیوں نے سید صاحب سے مدد طلب کی،آپ نے تیاری کی اور ساتھیوں کے ہمراہ نصیرآباد پہونچے۔آپ کی کوشش مصالحت کی تھی،ادھر شیعوں نے لکھنو نواب اودھ کے پاس شکایت بھیجی،مگر معتمد الدولہ آغا میر نے آپ کو لکھنو طلب کیا،اور معاملہ کو آگے بڑھنے نہیں دیا۔لکھنو میں آپ نے ہدایت واصلاح کا سلسلہ جاری رکھا اور ہزاروں لوگ آپ سے بیعت ہوئے۔

معرکہ بالاکوٹ:

سید صاحب رام پور کے اصلاحی دورے پر تھے،وہاں پتہ چلا کہ افغانستان کے علاقے میں راجہ رنجیت کے لوگوں نے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔سید صاحب کو شوق جہاد تو شروع سے ہی تھا،وہ ہندوستان میں اسلامی حکومت کی بحالی اور شرعی نظام کا اجراء چاہتے تھے،اوراسی غرض سے امیر خان کی فوج میں شرکت بھی کی تھی،لیکن وقت اور مقام کا تعین نہیں ہوا تھا،اب جبکہ افغانوں سے سکھوں کے مظالم کے متعلق سنا تو ان سے جہاد کرنے کا خیال پیدا ہوا۔لیکن جہاد کا کام ایسا نہ تھا کہ جھٹ پٹ انجام کو پہونچ جائے۔آپ نے فیصلہ کیا کہ پہلے فریضۂ حج ادا کرلیا جائے،اوراس کے بعد سکھوں سے جہاد کریں۔

چنانچہ ۳۰/جولائی ۱۸۱۲ء کو چارسو مردوں وعورتوں کے ساتھ رائے بریلی سے کلکتہ کے لئے روانہ ہوئے،راستے میں الہ آباد،بنارس،پٹنہ،بھاگلپور اور مونگیر میں قیام کیا اور اصلاح وہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔آپ کا یہ دورہ بلاد مشرق کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے،اب ان اضلاع کے لوگوں کو موقع ملا کہ اسلامی ہندوستان کے سب سے اہم مذہبی خاندان کے آفتاب وماہتاب حضرت شاہ اسماعیلؒ پوتے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی وحضرت مولانا عبدالحیؒ داماد حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اوران دونوں کے پیرومرشد حضرت سید احمد شہیدؒ سے براہ راست فیضیاب ہوں۔'' یہ حضرات اپنے مواعظ

میں کفر وشرک سے مجتنب رہنے، بدعت سے پرہیز کرنے کی دعوت دیتے اور خصوصی طور پر لوگوں کو سکھوں کے خلاف جہاد پر ابھارتے۔ (موج کوثر)

حج سے واپسی پر وطن پہونچ کر آپ نے سکھوں کے خلاف جہاد کی تیاری شروع کی اور مولانا اسماعیل و مولانا عبدالحی کو اطراف ہندوستان میں اس مقصد کے لئے بھیجا۔ ۱۸۲۶ء میں سفر جہاد کے لئے روانہ ہوئے، اس وقت آپ کے ساتھ چھ سات ہزار لوگ تھے۔ اس سفر میں آپ گوالیار، ٹونک، مارواڑ، حیدرآباد، سندھ، شکارپور، درہ بولان اور قندھار ہوتے ہوئے کابل پہنچے اور وہاں سے نوشہرہ تشریف لے گئے۔ پہلا معرکہ اکوڑہ میں ہوا، جس میں مجاہدین کامیاب رہے، اس کے بعد ''شبخون حضرو'' کا واقعہ پیش آیا، جس میں بہت سامال غنیمت مجاہدین کے ہاتھ آیا۔ ان دونوں معرکوں کے کچھ عرصہ بعد علماء ورؤسائے علاقہ نے آپ کے ہاتھ پر بیعت امامت کی، اور آپ کو باقاعدہ امیر المومنین منتخب کیا۔ تاکہ آپ کو انتظام جہاد، تقسیم غنائم، اقامت جمعہ اور ترویج شریعت کا پورا اختیار ہو اور آپ کے نام کا خطبہ پڑھا جائے۔ اس کے بعد حاکمان پشاور نے آپ کی اطاعت قبول کی۔ لیکن بعد میں عشر وزکوۃ کی ادائیگی کا مسئلہ آیا تو (مسیلمہ کذاب کے ساتھیوں کی طرح) علاقہ کے لوگوں نے اسے بوجھ محسوس کیا۔ اسی طرح حضرت کے ساتھیوں نے جلد بازی میں نفاذ شریعت چاہا اور رسوم وبدعات کی بیخ کنی شروع کی، تو یہ چیز بھی علاقہ کے رسم ورواج کے خلاف ہونے کی وجہ سے موجب وحشت ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سرداران پشاور نے آپ کو زبردست نقصان پہنچایا۔ مسلمانوں کی اس غداری سے سید صاحب کو سخت صدمہ ہوا۔ اس کے بعد ۶ رمئی، ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ اور مٹی کورٹ کے درمیان رنجیت سنگھ کے بیٹے سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ دونوں طرف سے بہت سارے لوگ مارے گئے اور اسی جنگ میں سید احمد شہیدؒ اور اسماعیل شہید دونوں نے جام شہادت پیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

۱۸۵۷ء تھانہ بھون کا ہنگامہ:

شاہ عبدالعزیزؒ محدث کے شاگرد مولانا رشید الدینؒ دہلوی تھے اور ان کے شاگرد مولانا مملوک علیؒ نانوتوی تھے، جنھوں نے مولانا محمد قاسمؒ نانوتوی اور مولانا رشید احمدؒ گنگوہی

کی تربیت کی تھی۔شاہ عبدالعزیز کے جانشین شاہ اسحاقؒ جنھوں نے تحریک کی ناکامی کے بعد، دہلی میں اپنا درس جاری رکھا تھا اور سید احمد شہید کی مالی اور اخلاقی مدد بھی جاری رکھے ہوئے تھے، وہ دہلی سے مکہ معظّمہ ہجرت کر گئے۔اور درس وتدریس کا مشغلہ وہاں شروع کیا۔ ہندوستان میں شاہ محمد اسحاقؒ کے شاگردوں میں کئی تبحر علماء تھے،جن میں شاہ عبدالغنی، مولانا فضل الرحمن گنج مرادآبادی،مولانا احمد علی سہارنپوری اور حاجی امداداللہ مہاجرمکی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ ہیں۔حاجی امداداللہ مہاجرمکی بیک واسطہ(شیخ نورمحمد) سید احمد شہید کے خلیفہ بھی تھی۔مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی، حاجی امداداللہ صاحب کے خلیفہ تھے۔ان لوگوں نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ تھانہ بھون میں حصہ لیا تھا،جس میں حافظ ضامن شہید ہوگئے تھے اور مولانا نانوتوی کو بھی ایک گولی لگی تھے۔

قیام دارالعلوم دیوبند:

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے دس سال بعد ان بزرگوں نے ۱۸۶۷ء میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی،تاکہ ملک میں اسلام اور مسلمانوں کی بقاء کے لئے رجال کار تیار کئے جائیں۔ دارالعلوم دیوبند کے قیام کے مقاصد وہی تھے،جو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا نصب العین تھا،اس حساب سے دارالعلوم کا موسس اول اگر شاہ ولی اللہ کو کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔قیام دارالعلوم کا مقصد احیاء دین،عقیدہ توحید کی دعوت،قرآن وسنت کی تعلیم وتبلیغ، بدعات ورسوم اور بے دینوں کے ذریعہ پھیلائی گئی گمراہیوں کی بیخ کنی،اور ایسے رجال کار وعلماء کی تربیت جو اپنے اخلاق وکردار میں قرن اول کے مسلمانوں کے مشابہ ہوں۔تاریخ گواہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔اور یہاں ایسے ایسے علماء، مشائخ،فقہاء، محدثین، مفسرین، مجاہدین اور مبلغین تیار ہوئے،جن کے علم وعمل،زہدورع،تقوی وطہارت،اخلاق وکرداراور کارناموں کی دھوم دنیا میں مچی ہوئی ہے۔حضرت ظفر بجنوری رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب کہا ہے:

یہ علم وہنر کا گہوارہ تاریخ کا وہ شہہ پارہ ہے
ہر ذرہ یہاں ایک شعلہ ہے،ہر سرو یہاں مینارہ ہے

جووادی فاراں سے اٹھی، گونجی ہے وہی تکبیر یہاں
ہستی کے صنم خانوں کے لئے ہوتا ہے حرم تعمیر یہاں
برسا ہے یہاں وہ ابرکرم اٹھا تھا جوسوئے یثرب سے
اس وادی کا سارادامن سیراب ہے جوئے یثرب سے
اسلام کے اس مرکز سے ہوئی تقدیس عیاں آزادی کی
اس بام حرم سے گونجی ہے،سوبار اذاں آزادی کی
اس وادی گل کا ہرغنچہ خورشید جہاں کہلایا ہے
جورند یہا ں سے اٹھا ہے، وہ پیر مغاں کہلایا ہے
جوشمع یقین روشن ہے یہاں وہ شمع حرم کی پرتو ہے
اس بزم ولی اللہی میں تنویر نبوت کی ضو ہے

شیخ الہندمولانامحمودحسن دیوبندی:

دارالعلوم دیوبند میں رہ کرجن لوگوں نے تحصیل علم اورکسب فیض کیا،ان میں سرفہرست ذات شیخ الہندمولانامحمودحسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔حضرت شیخ الہندرحمۃ اللہ علیہ نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے اوراس کے بعد کے احوال کوبہت قریب سے دیکھا تھا۔ان کے استاذ اوردارالعلوم کے روح رواں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے قیام دارالعلوم کے فوراً بعد ایک تنظیم بنام ’’ثمرۃ التربیت‘‘ تشکیل دی تھی،جس کے مقصد کومشہور مورخ مولانامحمدمیاں صاحب نے اس طرح بیان کیاہے:’’ثمرۃ التربیت‘‘ سےصرف فضلاء ومنتسبین دارالعلوم کی تنظیم مقصودنہیں تھی، بلکہ دراصل مقصد ایسے باحوصلہ افرادکی تنظیم تھی جو قیام دارالعلوم کےمقصد ۱۸۵۷ءکی تلافی کےسلسلہ میں کام کرسکیں۔(اسیران مالٹا)

اس انجمن کے قیام کے دوسال بعد ہی حضرت نانوتویؒ کا انتقال ہوگیا،جس کی وجہ سے انجمن میں ضابطہ کی سرگرمیاں جاری نہ رہ سکیں۔تاہم انفرادی طورپرحضرت شیخ الہند شاگردوں کی ذہن سازی کرتے رہے۔چنانچہ موجودہ پاکستان کے سرحدی اورقبائلی علاقوں سے جوطلبہ دیوبند آتے ،وہ حضرت شیخ الہند کے سیاسی افکاروخیالات کے مبلغ

بن کر جاتے۔اس کے بعد جمعیۃ الانصار کے نام سے حضرت نے ایک تنظیم کی داغ بیل ڈالی،جس کا مرکز دہلی میں قائم ہوا،اس کے سربراہ مولانا عبیداللہ سندھی تھے۔مولانا عبیداللہ سندھی نے انقلابی لیڈروں مولانا محمد علی جوہر،اورمولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ سے تعلقات بڑھائے۔ادھر حضرت شیخ الہند کے شاگردوں نے سرحدی علاقوں میں حلقے بنالئے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں جب جرمنی (اس کے ساتھ ترکی بھی تھا) اور برطانیہ میں جنگ عظیم چھڑگئی،تو حالات دھماکہ خیز ہوگئے اورضرورت محسوس ہوئی کہ اس وقت برطانیہ کو نقصان پہونچایا جائے۔چنانچہ یاغستان (آزاد قبائل کی ریاست باجوڑ) کے موضع ''زیگی'' کومرکز بناکر حضرت شیخ الہند کے خدام مولانا سیف الرحمان،حاجی ترنگ زئی وغیرہ نے انگریزوں سے باقاعدہ جنگ شروع کردی۔ان کے لئے رسد کا انتظام حضرت شیخ الہند کرایا کرتے تھے،کچھ دنوں تک جہاد بہت کامیابی سے جاری رہا،لیکن جلد ہی رسد کی کمی اورمخالفانہ پروپیگنڈا کہ یہ شرعی جہاد نہیں ہے،جہاد کے لئے امیر ہونا ضروری ہے،اس کی وجہ سے رکاوٹیں آنے لگیں۔توتحریک کے قائد حضرت شیخ الہند نے بیرونی حکومتوں سے تعاون حاصل کرنے کا ارادہ کیا،چنانچہ آپ نے مولانا عبیداللہ کوافغانستان بھیجا اورخود اپنے رفقاء کے ساتھ حجاز مقدس کا ارادہ کیا۔تاکہ خلافت عثمانیہ کی طرف سے انگریزوں سے جہاد کے پیغامات اور بوقت ضرورت فوجی امداد کی راہ ہموار کی جاسکے۔

کابل پہنچ کرمولانا عبیداللہ سندھی نے سفارتی طرز کی سرگرمیاں جاری رکھیں۔اوردو اہم کام کئے۔ایک تو یہ کہ ہندوستان کی جلاوطن حکومت ''حکومت موقتہ ہند'' میں شرکت،جس کے صدر مہاراجہ پرتاپ سنگھ اوروزراء مولانا عبیداللہ سندھی اورمولانا برکت اللہ بنائے گئے۔دوسرا اہم کام یہ ہوا کہ جنود ربانیہ کے نام سے ایک انجمن تشکیل دی جس کا مرکز مدینہ منور تھااورجس کے قائد حضرت شیخ الہند تھے۔مکہ معظمہ پہونچ کر حضرت شیخ الہند ترکی حکومت کی طرف سے ایک پیغام لینے میں کامیاب ہوگئے،جس میں مسلمانوں سے ظالم انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی اپیل کی گئی تھی۔ساتھ ہی مدد فراہم کرنے کا وعدہ بھی تھا۔یہ پیغام آپ نے آزاد قبائل میں تقسیم کرادئے اوراس کا بڑا اثر بھی ہوا۔لیکن اس

وقت حالات بدل چکے تھے، برطانیہ کا پلڑا بھاری ہو چکا تھا، ترکی اور جرمنی کو شکست ہوگئی۔

دوسری طرف شریف مکہ نے ترکی حکومت کے خلاف بغاوت کردی، جس کی وجہ سے عرب علاقوں میں ترکی کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔اس وقت حضرت شیخ الہند طائف میں تھے، آپ کو گرفتار کر کے مالٹا میں قید کردیا گیا۔حجاز کے سفر اوراس کے بعد مالٹا میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی حضرت شیخ الہند کے ساتھ تھے۔(تحریک آزادی میں مسلم علماء وعوام کا کردار)

جمعیۃ العلماء ہند:

شیخ الہند قید سے رہائی کے بعد وطن لوٹے، یہاں آپ کے ہمنواؤں اور شاگردوں کی ایک بڑی جماعت تحریک آزادی کے لئے سرگرم عمل تھی۔مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر مختار انصاری، مفتی کفایت اللہ، مولانا فضل حق خیرآبادی، مولانا عبدالباری، موہن داس کرم چند گاندھی، جواہر لعل نہرو، حکیم اجمل سبھی قائدین سرگرم عمل تھے، اور''جمعیۃ العلماء'' کے نام سے ایک دستوری جماعت بھی بن چکی تھی۔شیخ الہند کے استقبال کے لئے بمبئ کے ساحل پر موہن داس کرم چند گاندھی اور مولانا عبدالباری جیسے قائدین موجود تھے۔حضرت نے یہیں آئندہ کی حکمت عملی پر ان حضرات سے گفتگو فرمائی، اس کے بعد دیوبند گئے۔تاہم شیخ الہند کا بہت جلد انتقال ہو گیا۔

شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی:

حضرت شیخ الہند کے بعد شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ آپ کے جانشین ہوئے۔وہی بعد میں جمعیۃ العلماء کے صدر بھی بنے۔شیخ الاسلام کی قیادت میں جمعیۃ العلماء ہند تحریک آزادی کے ہر محاذ پر کانگریس کے ہمدوش رہی۔یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء کو ملک آزاد ہو گیا۔مگر یہ آزادی مسلمانوں کے تصور کے خلاف تھی۔اس موقع پر مولانا حسین احمد مدنی صدر جمعیۃ العلماء، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی وغیرہ نے ہندوستان میں مسلمانوں کو جمائے رکھنے اوران کی سراسیمگی دور کر کے انہیں عزم وحوصلہ عطا کرنے میں عظیم خدمات انجام دیں۔اس کے بعد ان بزرگوں نے اول اس جانب توجہ

کی کہ نئے ہندوستان کا دستور ایسا بنے جس میں یہاں کے ہر باشندے کو یکساں حیثیت ملے،اور مکمل آزادی عطا کی جائے۔چنانچہ اس میں کامیابی ملی۔

اس کے بعد دینی وملی تشخص کی حفاظت کے لئے دینی مدارس ومکاتب کے قیام کو ضروری سمجھا گیا، چنانچہ جمعیۃ العلماء نے اس کے لئے تحریک چلائی اور ۱۹۵۴ء میں باقاعدہ بمبئی میں ایک کنونشن بلائی۔ جانشین شیخ الہند حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: دینی تعلیم اوراس کی اشاعت یوں تو مسلمانوں کے لئے ہر زمانہ میں تمام ضروریات سے اعلی سمجھی گئی ہے،مگر انڈین یونین (بھارت) میں وہ انتہائی درجہ کو پہونچ گئی ہے۔سیکولر اسٹیٹ میں مسلمانوں کا مستقبل محفوظ رہ سکتا ہے تو صرف دینی مدارس ہی کے زیادہ سے زیادہ اجراء اوران کی ترقیات سے محفوظ رہ سکتا ہے۔اس لئے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس میدان میں اپنی جدوجہد کو تیز تر کردے۔(دینی تعلیمی تحریک اوردستور العمل)

تحریک آزادی اور اس کے بعد پرتاپ گڑھ

مولانا سید محمد امین نصیر آبادی:

حضرت مولانا سید محمد امین نصیر آبادیؒ کہنے کو تو نصیر آباد رائے بریلی کے تھے، لیکن ان کی دینی، اصلاحی، تعلیمی و تبلیغی جدوجہد کا سب سے اہم مرکز پرتاپ گڈھ ہی تھا، پرتاپ گڑھ کا چپہ چپہ ان کے نام سے واقف اور کارناموں کا گواہ ہے۔ اصلاح و تربیت کا اس وقت پرتاپ گڑھ میں جو کچھ بھی کام ہوا اس میں حضرت والا بنفس نفیس شریک رہے ہیں۔ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعد بھی پرتاپ گڑھ میں مسلمانوں کی دینی قیادت جن لوگوں کے ہاتھ رہی؛ وہ سب انہیں کے وابستگان تھے۔ لہذا ان کے تذکرہ کے بغیر پرتاپ گڑھ کی کوئی بھی مذہبی و اصلاحی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی ہے۔

حضرت سید صاحبؒ عظیم محدث، یگانہ روزگار فقیہ، یکتائے زمانہ عالم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب کشف و کرامت، شب بیدار عابد و زاہد اور خدا رسیدہ بزرگ تھے، باری تعالی نے انہیں غیر معمولی وجاہت اور رعب و ہیبت کا وافر مقدار میں حصہ دیا تھا، ان کی دعاؤں میں بھی بڑی تاثیر تھی۔ اصلاً وہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تحریک کے عظیم فرزند حضرت سید احمد شہید کے روحانی، خاندانی نیز علمی و عملی جانشین تھے اور ان کے نظام کو حتی المقدور نافذ کرنے کا عزم مصمم لئے ہوئے تھے۔ انگریز اور اس کے پورے نظام سے انہیں حد درجہ عداوت اور دشمنی تھی۔ انگریزی نظام حکومت کے خلاف اپنے حلقہ ارادت میں انھوں نے اپنے انداز کی گویا ایک اسلامی حکومت قائم کرلی تھی، جس کے وہ حاکم تھے، بحیثیت قاضی خود ہی فیصلے کرتے اور اپنے رعب، جاہ و جلال سے اسے نافذ بھی کرتے۔ پرتاپ گڑھ کی

قریشی برادری کے لوگ سید صاحب کے مشن اور تحریک کے اہم سپاہی تھے، جو بقول مولانا نجم الدین اصلاحی اپنی ہمت وجواں نمردی میں عربوں اور افغانوں کا نمونہ ہیں۔

تحریک آزادی اور سید صاحب:

تحریک آزادی کا زمانہ تھا، گاندھی جی اور کانگریس کی حکمت عملی عروج پر تھی، ہر طرف ہندو مسلم اتحاد کے نعرے تھے، اکابر علمائے دیو بند اور دیگر علماء تقریباً سبھی ان تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ لیکن سید صاحب نے اپنے کو ان تحریکات سے دور رکھا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے بہت سے لوگ ان پر طعن وتشنیع کیا کرتے۔ مولانا نجم الدین اصلاحی صاحب لکھتے ہیں کہ مسئلہ ترک موالات، یا تحریک آزادی کوئی ایسی چیز نہ تھی، جس پر سید صاحب کوئی رائے نہ رکھتے ہوں، لیکن آپ کا طریقۂ کار وہ تھا جو اس تحریک آزادی ہند کے موسس مولانا اسماعیل شہید اور آپ کے مرشد حضرت سید احمد شہید کا تھا......

حضرت سید صاحب بھی آخر اسی میکدہ قطبیت کے بادہ خوار تھے، بالخصوص سید احمد شہید کے خاندانی علوم ومعارف اور سینہ بسینہ فیوض وبرکات کی آپ کی ذات سچی مستحق اور جانشین تھی، یہ کیوں کر ہوسکتا تھا کہ آپ اس سنت اسلاف سے اختلاف کرتے، ہاں موجودہ تحریکات کے طریق کار سے اختلاف رہا۔ (یادگار اسلاف) اس سلسلے میں ان کے نظریات کیا تھے، خود انہیں کی زبانی سنئے، ایک خط کے جواب میں فرماتے ہیں:

’’سنو صاحب! خدا پرست اور بت پرست بھلا ایک ہوسکتا ہے؟ قرآن و پُران برابر ہوسکتا ہے؟ یہ گاندھی کی آندھی ہے جو کتنوں کو اڑا لے جائے گی۔ ہاں! اگر خلافت راشدہ کا سوال ہوتا یا خلافت علی منہاج النبوہ کا استفسار ہوتا، تو البتہ جواب دیتا...... مسٹر محمد علی (جوہر) صاحب کا خط آیا، میں نے صاف جواب لکھوا دیا کہ مجھے آزادی سے نہ کبھی اختلاف رہا ہے اور نہ اب ہے، طریق کار سے اختلاف ہے۔ میرا طریقہ میرے اسلاف اور خاندانی بزرگ حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا، اعلاء کلمۃ الحق میں کبھی باک نہیں کیا۔ جو لوگ فقیر کے وعظوں میں شریک رہے ہیں، انہیں اندازہ ہوگا کہ فقیر نے انگریز رنگریز کے خلاف کس طرح زبان کھولی ہے؛ جب کہ برملا گورنمنٹ

انگلشیہ کو مخاطب کرنا' دارورسن (سولی پر لٹکائے جانے) کے مرادف تھا، بعون اللہ عدالت نصاری میں جانے سے ہمیشہ پناہ مانگی اور معتقدین کے سینکڑوں معاملات شرع شریف سے طے کرادئے۔(یادگار سلف: ۱۳۴)

مولانا نجم الدین اصلاحی صاحب لکھتے ہیں: ان چند سطروں میں حقیقت آزادی ہند کی روح اوراس کا صحیح فلسفہ موجود ہے، آج تک کے تاریخی حالات شاہد ہیں اور واقعات گواہ ہیں کہ مولانا نے جواشارات فرمائے تھے، آج وہ کس طرح حرف بحرف صادق آئے......

بہر حال سید صاحب مسئلہ آزادی اور ترک موالات کے متعلق اپنی خاص رائے رکھتے تھے، چنانچہ (رائے بریلی کے) گوجروں اور (پرتاپ گڑھ کے) قریشیوں کی شجاع وبہادر قوم کو ہزاروں کی تعداد میں آڑے وقتوں کے لئے تیار کررکھا تھا۔ملتان، بنارس، کلکتہ، بمبئی، رنگون وغیرہ چھاؤنیوں میں آپ کے معتقدین کی کافی تعداد ہمیشہ رہا کی ہے۔کیا (سید صاحب کے) ان اشارات کے اندر ارباب حل وعقد کو کسی خوش آئند مستقبل اور آزادی ہند وتمکن فی الارض کا سراغ نہیں ملتا؟ افسوس!

آن قدح بشکست وآں ساقی نماند

طریق اصلاح ودعوت:

حضرت سید صاحب نے اصلاح قوم وتنظیم ملت کے لئے معمول بنالیا تھا کہ ہر جمعہ کو وعظ فرمایا کرتے تھے۔ جمعہ کے دن یہ معمول تھا کہ صبح دن نکلنے کے بعد سے جمعہ کے وقت تک آپ کسی حجرہ یا کونہ میں الگ رہتے تھے، نہ کوئی وہاں جاسکتا تھا اور نہ جانے کی اجازت تھی، کھانا، پینا، سلام وکلام، درس وتدریس، ملنا جلنا، عصر تک موقوف رہتا۔ زوال پر ہی اذان ہوتی اور آپ سنتیں پڑھ کر فوراً منبر پر بیٹھ جاتے۔ لوگوں کا متفقہ بیان ہے کہ جمعہ اور خطبۂ جمعہ کی وہ شان نظر آتی تھی جو آپ کے بعد پھر کبھی دیکھنے میں نہ آئی، گویا یہ ایک خلیفہ وقت تھا جو مسائل دینی ودنیوی پر احکامات نافذ کررہا تھا، خطبہ کی زبان عربی ہوتی تھی۔

نماز جمعہ کے بعد عصر تک مادری زبان میں وعظ شروع ہوتا، ابتداء اعوذ باللہ، بسم اللہ کے بعد قرآن مجید کی چند آیات، جو سامعین کے مناسب حال اور وقتی مسائل کے تحت

ہوتیں، تلاوت فرماتے تھے، کہ دفعتہ مجمع کا یہ عالم ہوتا تھا کہ آخر تک ساکت وصامت تصویر حیرت بن کر متوجہ رہا کرتا، اور پھر جب آپ اپنی نظریں اٹھا کر مجمع کو مخاطب کرتے تھے تو کیا مجال کہ کوئی دم مار سکے۔ اہل علم اور عامی دونوں اثر میں ڈوب جاتے تھے۔ (یادگار سلف)

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے پیشرو سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی طرح طریقہ محمدی ﷺ پر بیعت کیا کرتے تھے، اتباع سنت واعمال صالحہ کا عہد کراتے، شرک و بدعت، معاصی وغلط رسوم سے توبہ کراتے۔ فرائض خصوصاً نماز کی بجا آوری کے بارے میں سخت عہد ہوتا۔

نہی عن المنکر میں سختی:

حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کاروان ایمان وعزیمت میں تحریر فرماتے ہیں: حضرت مولانا سید محمد امین نصیر آبادی سے جو نفع پہنچا اور عقائد واعمال کی جو اصلاح ہوئی، اس کے اثرات رائے بریلی، پرتاپ گڑھ، سلطانپور، جونپور اور اعظم گڑھ کے قصبات ودیہاتوں میں دیکھے جاسکتے ہیں، ان کے مریدین میں جو تشرع واستقامت، فرائض کی پابندی اور دینی پختگی ہے، اس کی مثال کم ملے گی..... حقیقت یہ ہے کہ شریعت پر استقامت اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں آپ اپنے زمانہ کے امام تھے۔ آپ امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں صرف ارشاد وتلقین پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ ضرورت ہوتی تو قوت بازو سے بھی کام لیا کرتے تھے۔

حضرت مولانا اعجاز صاحب شیخوپوری حیات مصلح الامۃ میں تحریر فرماتے ہیں: حق تعالی نے مولانا (سید امین نصیر آبادی) کو شاہانہ دبدبہ اور جاہ وجلال عطا فرما رکھا تھا، جس طرف نکل جاتے دینداری کی باد بہاری چل جاتی، منکرات وفواحش سر چھپا لیتے، نہی عن المنکر میں مولانا کا خاص انداز تھا، ان کے دبدبہ حق کے سامنے بڑے بڑوں کا زہرہ آب ہوجاتا، سامنے سے اگر کوئی ٹخنوں سے نیچے پاجامہ لنگی کرکے گزر جاتا تو بلا کر زائد کپڑا قینچی سے کٹوادیتے، کوئی مسلمان بڑی مونچھیں رکھے ہوئے ہوتا تو اسے بھی ترشوادیتے، مجال نہ تھی کہ کوئی دم مارتا، بدعات ورسوم کے سخت مخالف تھے۔

مصلح ملت مولانا محمد یار ؒ صاحب کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ سید صاحب کا قافلہ جائس کی

طرف سے گزر رہا تھا، وہاں ایک داروغہ راستہ میں کھڑا تھا، جو مسلمان تھا اور مونچھیں اس کی غیر شرعی تھیں، لوگوں نے اس کہا کہ راستہ سے ہٹ جاؤ، سید صاحب کا قافلہ ادھر سے گذرنے کو ہے، وہ بڑی مونچھوں کو نہ صرف ناپسند کرتے ہیں، بلکہ اسے کٹوا بھی دیتے ہیں۔ داروغہ نے متکبرانہ لہجے میں کہا: کیا ان میں اتنی جرأت ہے کہ میری مونچھوں کو ہاتھ لگادیں، اگر انھوں نے ایسا کیا تو ہم دیکھ لیں گے؟ ادھر حضرت سید صاحب کی نظر جوں ہی اس دارغہ پر پڑی، فوراً اپنے خادم محمد واجد علی کو قینچی لا کر اس کی ایک طرف کی مونچھیں کاٹنے کا حکم فرمایا۔ خادم واجد صاحب قینچی لے کر جب اس کی طرف بڑھے تو اس نے سر جھکا لیا، اور خاموشی سے مونچھیں کٹوالیں۔ لوگوں نے بعد میں داروغہ سے پوچھا کہ کیا بات! پہلے تو تم بڑی ڈینگیں مار رہے تھے، مگر سامنا ہوتے ہی ہکا بکا دکھے؟۔ تب اس نے عقدہ حل کیا کہ ان کا خادم جب میری طرف بڑھا، تو میں نے دیکھا کہ دو شیر منھ پھاڑے میرے سامنے کھڑے تھے، اگر میں ذراسی جنبش کرتا تو وہ مجھے چیر پھاڑ ڈالتے، مجبوراً اطاعت کے سوا چارہ نہ تھا، اس لئے خاموش رہا۔

تمباکو اور حقہ نوشی کے خلاف سخت رائے رکھتے تھے۔ چنانچہ جس علاقہ میں سید صاحب کا دورہ ہونے کو ہوتا، وہاں کے لوگ تمباکو وحقہ نوشی ترک کردیتے اور اپنے لباس وبدن کو بھی تمباکو کے اثرات سے صاف کر لیتے۔ دھوتی پہننے والے لوگ لنگی پہننا شروع کردیتے۔ منشی محمد مقبول تلوری حضرت مولانا محمد یار صاحب کے حوالہ سے بیان کرتے تھے: کہ ایک علاقہ (جو غالباً سلطان پور کی طرف ہے، وہاں) کے لوگ سید صاحب کی آمد سے پہلے اپنا لباس اور وضع قطع درست کررہے تھے، وہاں کے ایک گنوار مسلمان جو پہلوان تھا اور سید صاحب سے ناواقف تھا، اس نے لوگوں سے پوچھا کیا بات ہے جو اس طرح تم لوگ تیاری میں لگے ہو؟ لوگوں نے اس سے بتایا کیا کہ سید صاحب دھوتی کو ناپسند کرتے ہیں، اگر کسی کو دھوتی پہنا ہوا دیکھ لیتے ہیں تو اس کی دھوتی پھاڑ کر لنگی بنادیتے ہیں، اور تمباکو والوں کو تو سزا بھی دیتے ہیں۔

اس نے کہا اچھا میں اس مولوی کو دیکھوں گا۔ چنانچہ حضرت کی آمد کے بعد ایک دن

صبح سویرے وہ اس جگہ گیا، جہاں حضرت کا قیام تھا، سید صاحب نماز فجر کے بعد مراقبہ وتسبیحات میں مصروف تھے۔ اس گنوار کو اپنی طاقت اور پہلوانی پر ناز تھا، چنانچہ سیدھا حضرت کے پاس مسجد پہونچا اور گستاخانہ ادا سے ان کے پاس میں بیٹھنے کی کوشش کی، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے پوچھا، کیا تم نے نماز ادا کرلی؟۔ یہ گنوار الجھنے کی نیت سے تو گیا ہی تھا، بولا: نماز کیا ہے!!!۔ یہ سننا تھا کہ حضرت کو جلال آگیا، فوراً اٹھے اور اس کو زمین پر اتنے زور سے پٹخنی دی کہ وہ بے ہوش ہوگیا۔ حضرت نے وہاں موجود لوگوں سے کہا کہ اس کو لے جاؤ، نہلاؤ، دھلاؤ، پھر میرے پاس لاؤ۔ چنانچہ جب اس کو لایا گیا تو حضرت نے اس سے پوچھا: تم نے نماز ادا کی؟ اب وہ گڑگڑا رہا تھا اور ہاتھ جوڑ کر کہہ رہا تھا کہ حضرت میں نماز پڑھنا نہیں جانتا۔ مجھے سکھایئے۔ بعد کو وہ شخص گاؤں کے ان لوگوں کو بڑی گالی دے کر کہتا تھا کہ نالائقو! تم نے مجھ سے یہ کیوں نہ بتایا تھا کہ وہ مولوی بہت بڑا پہلوان بھی ہے۔ تبھی تو تم لوگ اس سے اتنا ڈرتے ہو۔

بارہا حضرت کی کرامت کا ظہور اس طرح بھی ہوا کہ میزبان نے گنے چنے چند مہمانوں کے لئے کھانا پکوایا، مگر حضرت کی آمد پر مہمانوں کی کثرت ہوگئی، اب وہ گھبرایا ہوا حضرت کے پاس آیا، حضرت نے کھانے میں برکت کی دعا کی اور توجہ فرمائی، پھر وہی کھانا قلت کے باوجود سب کے لئے کافی ہوگیا۔ ایسے ہی سنا ہے کہ ایک مرتبہ پرتاپ گڑھ کے کسی قریشی نے حضرت کو اپنے گھر مدعو کیا اور سواری کے لئے اپنے اس گھوڑے کو بھیجا جو نہایت شریر اور اپنے مالک کے علاوہ دوسرے کو اپنے پر سوار نہ ہونے دیتا۔ لیکن حضرت کا قدم رکھنا تھا کہ وہ وہ نہایت مطیع وفرماں بردار بن گیا۔

سماجی بائیکاٹ:

جو لوگ حکم شریعت کی کھلم کھلا مخالفت کرتے، زنا اور بدکرداری کے مرتکب ہوتے، رشوت یا سودخوری کے مرتکب ہوتے، سید صاحب ان کا بائیکاٹ کرادیتے، تا آں کہ وہ اس فعل شنیع سے توبہ کرلے، اور آئندہ ایسے کاموں سے بچنے کا عہد کرلے۔ بائیکاٹ کے باوجود رشتہ داروں اور اعزہ واقارب میں سے جو اس مجرم کے یہاں کھاتا، پیتا، یا شادی بیاہ

کرتا، اس کو بھی ٹاٹ باہر کرادیتے۔

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ غلط کاموں پر نکیر ببانگ دہل بلالومۃ لائم کیا کرتے تھے۔گاؤں شکوہ آباد (سگرا، پرتاپ گڑھ) کے شیخ عبد اللہ جو حضرت سید صاحب کے اولین میز بان اور حضرت والا کو اس علاقہ میں دعوت وتبلیغ کے لئے لے آنے والے تھے۔شیخ عبد اللہ تعلقہ دار تھے، انھوں نے گاؤں ہَدِراہی کی ایک برہمن دوشیزہ سے تعلقات زن وشوئی قائم کر لئے تھے، علاقہ کے مسلمانوں کی طرف سے اعراض واستنکاف پایا گیا تو مجبوراً توبہ کے لئے وہ حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو لے کر آئے۔ سید صاحب کے وہ بڑے قدرداں تھے، حضرت والا کا قیام علاقہ میں انہیں کے گھر ہوا کرتا تھا، ان سے حضرت والا کسی بات پر ناراض ہو گئے اور گاؤں ہنڈور (سگرا، پرتاپ گڑھ) میں دوران تقریر ان پر برس پڑے، شیخ عبد اللہ کو یہ بات گراں گزری، اور وہ جانے کے لئے اپنی سواری پر بیٹھ گئے، حضرت نے انہیں للکارتے ہوئے کہا: عبد اللہ! آج تو جاتا ہے، چلا جا! لیکن کل تو کہاں جائے گا، جب تیرے اوپر منوں مٹی پڑی ہوگی۔ چنانچہ بعد کو حضرت کی بدعاء کے اثرات خطرناک صورت میں ظاہر ہوئے۔

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس جاہ وجلال سے بعض لوگوں کو بڑی تکلیف بھی تھی، چنانچہ پرتاپ گڑھ شہر کے ایک بڑے صاحب جو بعد کو رکن اسمبلی بھی ہوئے، انھوں نے عدالت میں کسی شاہ (یعنی لفظ شاہ جس کے نام کا جزء تھا، اس) کے نام سے عدالت میں یہ رٹ داخل کرادی کہ سید امین نصیر آبادی کی وجہ سے ایسا ایسا ہوا، لہٰذا ان پر کارروائی ہو۔ چنانچہ سید صاحب کو عدالت میں حاضر ہونے کا حکم ہوا۔آپ پرتاپ گڑھ کی کچہری میں حاضر ہونے کے لئے جب گئے، تو قریشی برادری کے سینکڑوں لوگ لاٹھی ڈنڈوں نیز دیگر ہتھیاروں سے مسلح آپ کے ہمراہ تھے۔اب مخالفین نے اس بات کی بھی شکایت پولیس محکمہ میں درج کرائی اور کہا کہ نقض امن کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ بہرکیف سید صاحب سے جج نے پوچھا: آپ (فلاں) شاہ . . . .کو جانتے ہیں؟ فرمایا: کون شاہ؟ شاہ یمن؟ شاہ چین؟ شاہ ترکی؟ شاہ ایران؟ کون شاہ؟ آپ کے اس انداز گفتگو کا جج پر ایسا اثر ہوا کہ اس

نے یہ کہتے ہوئے مقدمہ خارج کر دیا کہ مدعی علیہ، مدعی کو جانتا تک نہیں، چہ جائے کہ اس کو نقصان پہونچائے۔

ایک مرتبہ ایک انگریز کو آپ نے مار دیا، مقدمہ سلطان پور کی عدالت میں دائر ہوا۔ سید صاحب اہل پرتا بگڈھ کی ایک بری تعداد کے ساتھ وہاں پہونچے۔ جج حضرت کے پرعظمت و پرجلال چہرے کو دیکھ کو بہت متاثر ہوا اور اپنی کرسی حضرت کے لئے چھوڑ دی، سید صاحب تڑخ کر بولے: میں نصاری کی کرسی پر نہیں بیٹھتا۔ بعد میں جج نے حضرت کو باعزت بری کر دیا تھا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ناراضگی:

ناظم ندوہ حضرت مولانا عبدالعلی صاحب برادر اکبر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی آپ کے خاندان اور اعزہ واقارب میں سے تھے۔ قیام ندوہ کے ابتدائی زمانہ میں انھوں نے سید صاحب کو جلسہ میں مدعو کیا تھا، سید صاحب نے وہاں تعلیم وتدریس اور ارکان کی وضع قطع کو دینی وشرعی مذاق کے خلاف پایا تو برداشت نہ کر سکے، اور ہمیشہ کے لئے شرکت ترک فرمادی۔ چنانچہ اپنے ایک مخلص حافظ فصیح الدین صاحب کو ایک مکتوب گرامی میں لکھتے ہیں:

''واضح ولائح باد جہت تسطیر ایں چند سطور کہ نامہ عنایت نما معمولی از نظامت ندوہ منجانب مولوی محمد علی صاحب ناظم بنام ایں نا کارہ انام، چنانچہ سال گذشتہ وعام پیوستہ ہم بعموم ملفوف ولفافہ خصوص رسیدہ، بعد بنا بر رسائی مجلس وحاضری محفل منعقدہ ہذا العام ......۔ حضرت سفیان بن عیینہ می فرماید: **من عمل بمایعلم فهو اعلم الناس، من ترک العمل بمایعلم فهو الجاهل** .....۔ و در بزار منقول است از آنحضرت صلعم: **مثل الذی یعلم الناس وینسی نفسه مثل الفتیلة تضئ علی الناس وتحترق نفسه**۔

''پس دیدہ باید کہ ازیں اجلاس چہ غایت بود کہ طریقہ تعلیم وترقی وعلوم اسلامیہ ہمیں کہ انگریزی نیز درج مدرسہ فیض عام وفلسفہ وعلوم حکمیہ در اشاعت وتفسیر وحدیث و در درس وتدریس بقلت حیف باشد واشاعت سنیہ مرضیہ وملت حنفیہ خیر الانام علیہ السلام را کہ .....۔ اسبال ازار در ارسال ولحیہ تراشیدہ وشوراب گذاشتہ وتشبہ کفار در اکثرے شرکاء جلسہ دخیل

کار ''ندوہ'' شدہ....العیاذ باللہ.....'' (یادگار سلف: ۱/ ۱۳۸)

نام ونسب:

سید محمد امین نصیر آبادیؒ کے والد کا نام محمد طٰہٰ تھا، آپ نسباً حسنی و حسینی تھے، وطن قصبہ نصیر آباد تھا، جو رائے بریلی کا مشہور تاریخی قصبہ ہے۔ ولادت: ۸ ؍ ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ ہی میں مولانا احمد حسن سے حاصل کی، پھر لکھنو چلے گئے اور وہاں مولانا عبد الحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کر کے تمام درسی کتابیں از بر کیں، علم حدیث پڑھنے کے شوق میں سہارنپور کا بھی قصد کیا اور محدث کبیر حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری سے حدیث کی کتابیں پڑھیں۔ وطن واپس آکر کچھ دنوں گھر پر قیام کیا۔ حج پر گئے تو علمائے حرمین سے بھی سند حدیث حاصل کی۔ بیعت وارادت کا تعلق حضرت خواجہ احمد نصیر آبادی سے کیا، ان کی وفات کے بعد حضرت خواجہ ضیاء النبیؒ حسنی نقشبندی مجددی سے بیعت ہوئے اور انہیں سے آپ کو خلافت واجازت بھی حاصل ہوئی۔ اکیس سال کی عمر میں علوم مروجہ کی تحصیل کر لی تھی، زمانہ طالب علمی میں ہی حضرت الاستاذ کہیں جاتے تو آپ کو اپنی جگہ بٹھا کر جاتے، چنانچہ اسی وقت سے آپ نے درس وتدریس، فقہ وفتاوی کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ آپ ایک جلیل القدر حنفی عالم تھے، البتہ مقلد جامد نہیں تھے، بلکہ آپ مجتہدانہ شان کے حامل تھے، اس لئے ہر مسئلہ کو قرآن وسنت سے تطبیق دیتے تھے، اس لئے جس مسئلہ کو احادیث وآثار کی روشنی میں زیادہ بہتر پاتے، اسی کے مطابق فتوی دیتے، اگر چہ وہ احناف کے خلاف ہی کیوں نہ ہوتا۔ اصلاً آپ کا مذہب شاہ ولی اللہ دہلوی اور علامہ فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہما کا تھا، ایک مکتوب گرامی میں فرماتے ہیں:

''مسلک فقیر مسلک شاہ ولی اللہ ومولانا فرنگی محلی است، چنانچہ بمجموعۃ الفتاوی بریں منوال رفتہ ام، وایں روش اختیار کردہ ام''۔ (مجموعۃ الفتاوی، تحقیق نجم الدین ندوی)

آپ کی وفات بروز دوشنبہ: ۱۲ ؍ جمادی الآخر، ۱۳۴۹ھ، مطابق ۵/ نومبر ۱۹۳۰ء میں ہوئی اور اپنی مسجد کے صحن میں آسودہ خواب ہوئے۔

علاقے میں آپ کا دورہ پینس (ڈولی) میں ہوا کرتا تھا۔ نماز اول وقت پڑھا

کرتے،اسی طرح جمعہ فی القریٰ کے موید تھے،چنانچہ علاقہ وار مسجدیں جمعہ کے لئے متعین کردی تھیں۔بے نمازی و بے پردہ عورتوں کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا نہیں کھاتے تھے،چنانچہ جہاں دعوت ہوتی،اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا کہ نمازی و باپردہ عورتیں ہی کھانا پکائیں۔

تحدیث بالنعمۃ کے طور پر عرض ہے کہ راقم آثم کے نانا اور دادا دونوں حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے۔دادی کی روایت سے والدہ ماجدہ بیان کرتی ہیں کہ ایک مرتبہ دادا جان مرحوم والد صاحب کو بچپن میں اپنے ہمراہ لے کر سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت نے فرمایا تھا کہ یہ(مولانا محمد یار صاحب) جب بڑے ہوجائیں تو ان کو میرے یہاں پڑھنے کے لئے بھیجنا۔

یوں تو حضرت کا کھانا زیادہ تر خادم خاص واجد علی ہی پکایا کرتے تھے،تاہم علاقہ میں جب کبھی حضرت کے لئے کھانا پکوانے کی نوبت آتی تو دادی مرحومہ نمازی و باپردہ خاتون ہونے کی وجہ سے اس ذمہ داری کو نبھاتیں۔چنانچہ اس توجہ،تعلق اور دعا کا اثر آگے چل کر اس طرح ہوا کہ والد ماجد (حضرت مولانا محمد یار صاحب رحمۃ اللہ علیہ) نصیر آباد میں حضرت کے مدرسہ کے طالب علم ہی نہیں ہوئے،بلکہ ایک زمانہ تک حضرت سید صاحب کے مدرسہ کے کرتا دھرتا بھی رہے اور ان تمام علاقوں میں حضرت کے نہج کے مطابق اصلاحی کام کو جاری وساری بھی رکھا،جہاں حضرت بکثرت جایا کرتے تھے۔والد صاحب کے پاس ترمذی شریف کا وہ نسخہ بھی تھا،جسے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا فرنگی محلی سے سبقاً سبقاً پڑھا تھا۔**فللہ الحمد و المنہ**

مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھی

حضرت مولانا سید محمد امین نصیر آبادی قدس سرہ العزیز نے اضلاع شرقیہ کے اپنے آخری دورہ میں ہر جگہ آیت کریمہ ’’**الیوم اکملت لکم دینکم** ...الخ‘‘ کو موضوع بنا کر نہایت جامع اور عالمانہ وعظ و بیان فرمایا۔اس سے ایک لطیف اشارہ دے رہے تھے کہ آپ اب دعوت و اصلاح اور تربیت،اعلاء کلمۃ اللہ،امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو رہے ہیں۔پرتاپ گڑھ میں بھی اس کو موضوع بنایا اور آخر میں فرمایا:

’’میرے بعد لوگ آئیں گے، نئی نئی راہ بتائیں گے، خبردار! خبردار! ان کی باتوں میں نہ آنا، مزید اگر ضرورت ہوگی تو محمد احمد یہ ہیں، ان سے پوچھ لینا‘‘۔ (تذکرۃ الامین)

مولانا محمد صغیر پرتاپ گڑھی لکھتے ہیں:

مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھی رحمۃ اللہ علیہ کا سب سے امتیازی وصف خوش خلقی، شفقت ومحبت کا برتاؤ، علماء، اولیاء اور طلبۂ کرام کا اعزاز واکرام کرنا تھا۔ آپ اخلاق حسنہ کے پیکر تھے، جو بھی ملتا پہلی ملاقات میں گرویدہ ہوجاتا، سادہ طبیعت، پاک طینت اور کریم النفس تھے، الغرض اعلی اوصاف اور مومنانہ کردار سے متصف تھے۔

آپ کی پوری زندگی علم وعمل، تقوی ودیانت اور قول وفعل کی جامعیت کی بے مثال اور قابل رشک زندگی تھی، سلف صالحین کا جیتا جاگتا نمونہ اور تصویر تھے....... قال وحال کی یکسانیت، شریعت وطریقت کی جامعیت اور فنا فی اللّٰہیت کے سبب اللہ ربّ العزت نے آپ کو بہت بافیض بنایا تھا۔ وہبی علوم سے آراستہ اس بافیض ہستی سے نہ جانے کتنے بڑے بڑے علماء اور فضلاء نے استفادہ کیا، جن میں اپنے زمانے کی بعض چنندہ شخصیات بھی ہیں: مثلاً مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاںؒ ندوی، حضرت مولانا قاری محمد صدیقؒ صاحب باندوی، حضرت مولانا ابرار الحق ہردوئی، وغیرہم۔ ان حضرات کا حال یہ تھا کہ جب بھی موقعہ پاتے آپ کی صحبت کو غنیمت وسعادت سمجھتے ہوئے خدمت میں حاضر ہوتے اور وقت رہتا تو کوئی ایک دن قیام بھی فرماتے۔

آپ کا زہد واستغناء اور دنیا سے بیزاری اپنے اعلیٰ مقام پر تھی۔ والد ماجد کی میراث سے اچھی خاصی زمین ملی تھی؛ مگر اس کی دیکھ بھال کی جانب کبھی متوجہ نہیں ہوئے؛ کچھ اراضی پر پڑوسیوں نے قبضہ کرلیا تو آپ نے اسے بھی دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی اور سب چھوڑ چھاڑ کر خانقاہ کی راہ اختیار فرمالی۔

دعوتی واصلاحی سرگرمیاں:

علم ظاہر کے اعتبار سے آپ اگرچہ کسی بڑے ادارے سے باقاعدہ سند یافتہ نہ تھے،

لیکن اہل اللہ کی صحبت نے ایسا جلا پیدا کردیا تھا کہ بہت سے فارغین پر فائق تھے،اس کا اندازہ آپ کے مواعظ،کلام اور تصانیف سے ہوتا ہے،نسبت مع اللہ اورعلم لدنی سے آراستہ پیراستہ تھے،وعظ کے دوران آیات قرآنیہ،احادیث نبویہ اور وجدانی تمثیلات وعرفانی تفصیلات اس خوش اسلوبی سے پیش فرماتے کہ لوگ حیرت میں ڈوب جاتے،قوم وملت کی اصلاح اوران کی تربیت کا جذبہ پیدائشی عطا ہوا تھا،چنانچہ بچپن ہی میں حال یہ تھا:

آپ اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ جب کھیلنے جاتے تو ایک جگہ ان کو جمع کر کے کھیل کود کے بجائے وعظ فرماتے۔بزرگوں کے واقعات اور عبرت ونصیحت کی باتیں ان کو سناتے قوم کی اصلاح اوران کو رسوم وبدعات سے بچانے کی ایسی لگن اللہ رب العزت نے دل میں پیدا کردی تھی کہ قرب وجوار کے مواضعات میں کبھی پیدل،کبھی سائیکل اور کبھی سواری سے جا کر وعظ ونصیحت فرماتے۔(تذکرہ مولانا محمد احمد)

ولادت وولدیت:

آپ کی ولادت باسعادت:۱۳۱۷ھ، مطابق۱۸۹۹ء میں موضع پھولپور میں ہوئی۔والد محترم کا نام نامی اسم گرامی جناب غلام محمد صاحب تھا۔جو سرکاری ملازمت سے وابستہ تھے۔سرکاری ملازم ہونے کے باوجود آپ انتہائی نیک وپارسا انسان تھے۔اویس زمانہ حضرت مولانا فضل الرحمان صاحب گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے اور برابر حضرت کی خدمت میں جایا کرتے تھے۔

ابتدا میں ان کے یہاں صرف چھ صاحبزادیاں تولد ہوئیں۔کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ ایک مرتبہ حضرت گنج مرادآبادی سے نرینہ اولاد کے لئے دعاء کی درخواست کی،تو حضرت نے فرمایا''دعاء کروں گا''انشاء اللہ بیٹا پیدا ہوگا،اس کا نام احمد رکھنا۔۱۳۱۳ھ میں حضرت گنج مرادآبادی رحلت فرماگئے،اس کے بعد اس دعاء کی قبولیت کے ظہور کا وقت آیا، اور ۱۳۱۷ھ میں غلام محمد صاحبؒ کے یہاں لڑکا تولد ہوا۔حضرت کے حکم کے مطابق''محمد احمد''نام رکھا گیا؛جو بعد میں چل کر شیخ وقت اور قطب دوراں ہوا۔

نرینہ اولاد میں اکلوتے تھے۔اس لئے بڑے ناز وانداز اور لاڈ وپیار سے آپ کی پر

ورش ہورہی تھی۔ مگر اللہ ربّ العزت کو کچھ اور ہی منظور تھا، مستقبل میں اس بچے سے بڑے بڑے کارہائے نمایاں لینے تھیں، مجاہدے کروانے تھے، اگر ناز ونعمت میں پلتا تو مجاہدے کیسے کرسکتا۔ مشیت ایزدی نے ۴ مئی ۱۹۱۴ء کو سایہ پدری سے محروم کردیا اور اس کے چند ہی دن بعد شفقت مادری سے بھی۔ والدین کے انتقال کے بعد آپ کی پرورش ننہال میں ہوئی۔

تعلیم وتربیت:

ابتدائی تعلیم اپنے وطن ہی میں حاصل فرمائی۔ باقی درسیات کی تکمیل اور فارسی وعربی کی تعلیم اپنے شیخ ومرشد حضرت مولانا سیّد بدر علی شاہ ازہری علیہ الرحمۃ کی خدمت میں رہ کر حاصل کی اور انہی سے اجازت حدیث بھی حاصل کی۔

حضرت مولانا سیّد بدر علی شاہ صاحبؒ جہاں جامعہ ازہر سے فارغ تھے، وہیں حضرت مولانا فضل الرحمان گنج مرادآبادی سے بھی حدیث پڑھی تھی اور اجازت حاصل کی تھی۔ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمان صاحبؒ نے حدیث شریف شاہ عبد العزیز محدّث دہلوی سے پڑھی تھی۔ اس طور پر حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ کو علم حدیث میں بھی اپنے زمانے کی انتہائی ارفع وعالی سند حاصل تھی۔ مگر فنا ونیستی کا غلبہ اس قدر تھا کہ اپنی شان علمی کا کبھی اظہار تک نہیں فرماتے تھے۔

بیعت وخلافت:

اپنے زمانے کے تمام ہی بزرگوں سے استفادہ کیا اور سب کی خدمت میں حاضری دی، خانقاہ ''تھانہ بھون'' بھی تشریف لے گئے اور حضرت حکیم الامّت مولانا اشرف علی تھانوی کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ فرماتے تھے کہ حضرت نے خاص توجہ فرمائی اور مجلس میں خاص جگہ پر بیٹھنے کا حکم فرمایا۔ کئی روز قیام کیا اور فیض حاصل کیا۔ حضرت نے نہایت شفقت کا معاملہ فرمایا۔

البتہ باضابطہ بیعت کا تعلق اولاً حضرت مولانا شاہ وارث حسن صاحب ''کوڑا جہاں آبادی'' قدس سرہٗ سے قائم فرمایا۔ تقریباً چار سال کا عرصہ حضرت کی خدمت میں گزارا اور حضرت نے اجازت سے مشرف فرمایا۔ مولانا شاہ وارث قدس سرہ کو بیعت حضرت

گنگوہی سے اور اجازت وخلافت حضرت شیخ الہند سے تھی۔

حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ ایک قادر الکلام شاعر بھی تھے۔لیکن آپ کی شاعری عام شاعری نہ تھی ، عام شعراء سے ہٹ کر اپنی طرز کے،اپنے انداز کے،اپنی قسم کے،اپنی شان کے نرالے اور بے مثال شاعر تھے۔آپ کا کلام اگر ایک طرف عارفانہ شان لئے ہوتا ہے،تو دوسری طرف ادبیت وشعریت سے بھر پور ہونے کے ساتھ ساتھ بے پناہ روانی وبے ساختگی کا بھی حامل ہے۔حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''آپ کا کلام نظم ہو یا نثر،اسی خم خانہ معرفت ووحدت کی شراب طہور ہوتی ہے؛ جس سے حاضرین مجلس کو نہ سیر ہوتی ، نہ گرانی بلکہ ان کی زبان پر یہ ہوتا:

مصلحت نیست مرا سیری ازیں آب حیات

ضاعف اللہ بہ کل زمان عطشیٰ (مقدمہ روح البیان:۲۷)

ابتداء میں آپ کا قیام مستقلاً اپنے وطن پھولپور میں ہی رہتا تھا اور کبھی کبھی شہر پرتاپ گڈھ میں بابا نجم الحسن کے مکان پر قیام کرتے ،ان کے پاکستان چلے جانے کے بعد وکیل عبد الوحید کے مکان پر ہوتا۔ ۱۹۳۲ء سے شہر الٰہ آباد میں بھی کبھی کبھی قیام فرمانے لگے تھے، یہ قیام ابتداء میں ''محلہ دارا گنج'' میں ہوتا تھا،اس کے بعد کچھ دنوں محلہ ''کٹرہ ودریا آباد'' میں بھی رہا۔پھر: ۱۴۰۰ھ سے چار سال تک ''مدرسہ بیت المعارف'' کے شمالی حجرہ میں قیام رہا۔دیرینہ مرض بواسیر نیز کبرسنی کی وجہ سے ضعف وکمزوری میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا تھا۔اس لئے آخری عمر میں اپنے معالج خاص ڈاکٹر ابرار احمد صاحب کے مکان پر مستقلاً قیام پذیر ہو گئے اور سفر وغیرہ بالکل بند کر دیا؛ حتی کہ وطن پرتاپ گڈھ وپھول پور بھی جانا بند ہو گیا تھا۔وفات سے کچھ دنوں پہلے سینہ میں درد شروع ہوا، علاج برابر چل رہا تھا؛ مگر درد بڑھتا ہی گیا اور بیہوشی کی سی کیفیت طاری ہوگئی ،جس کا سلسلہ کافی دنوں تک رہا۔ بالآخر: ۳؍ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۲؍اکتوبر ۱۹۹۱ء یکشنبہ کی شب اللہ کا یہ پیارا اپنے محبوب حقیقی سے جاملا۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

مولانا منیر احمدؒ یغمانی

حضرت مولانا منیر احمد یغمانی قدس سرہ حضرت مولانا سید محمد امین نصیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے بلاواسطہ شاگرد تھے، آپ کی ابتدائی تعلیم وتربیت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ ہوئی تھی۔ جس کا آپ کی پوری زندگی پر گہرا اثر تھا، تن تنہا آپ نے سید امین صاحب کے مشن کو زندہ رکھنے کی ہمیشہ پوری کوشش کی اور زندگی کے آخری پڑاؤ تک اس کے لئے کوشاں رہے۔

مکرمی ڈاکٹر تابش مہدی صاحب لکھتے ہیں:

قد دراز، سینہ کشادہ، بدن چھریرا، اعضاء خاصے موٹے، آنکھیں بڑی اور دور تک دیکھنے والی، پیشانی کھلی ہوئی بے پناہ ذہانت وفتانت کی غماز، آواز میں بلا کی کڑکی اور بلندی مگر سوز وگداز سے مالا مال، جس پر مارکین کا بڑی آستینوں والا لمبا اور سفید کرتا، پاجامے کی جگہ شلوار، جسے مذہبی حلقوں میں شرعی پاجامہ یا صرف شرعی کہا جاتا ہے۔ سر پر سفید اور پٹھے بال مگر کالی ٹوپی سے چھپے ہوئے۔ یہ ہے حلیہ اس مرد درویش کا، جسے پرتاپ گڈھ، الہ آباد، سلطان پور، لکھنو، رائے بریلی، جونپور اور اعظم گڈھ کے ایک بڑے مذہبی حلقے میں مولانا منیر احمد یغمانی کے نام سے جانا جاتا ہے۔

حضرت مولانا منیر احمدؒ یغمانی ایک نادر المثال اور لافانی شخصیت کے حامل تھے۔ وہ اپنے آپ میں ایک انجمن تھے۔ ایسی انجمن جس سے بھانت بھانت کی شخصیتیں وابستہ تھیں۔ ایسی منفرد انجمن جس کے احفاد ورفقاء میں مختلف النوع صلاحیتوں کے لوگ شامل تھے۔

قسام ازل نے علم وفضل اور گوناگوں صلاحیتوں کے معاملے میں حضرت مولانا کے ساتھ غیر معمولی فیاضی ودریادلی سے کام لیا تھا۔ یہ بھی قدرت کی بے پناہ فیاضی کی دلیل ہے کہ انھیں مجدد عصر حضرت مولانا سیّد امین نصیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ، محدث کبیر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی وحضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہما اللہ جیسے اعاظم رجال سے استفادے اور استفاضے کا موقع میسر آیا۔ ان کی زندگی میں سیّد محمد امین نصیر آبادیؒ کے ذوق اصلاح ملی، حضرت علامہ کشمیریؒ کے تبحر

علمی، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی پامردی اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کی اولوالعزمی اور حب الوطنی کا عکس بہ آسانی دیکھا جاسکتا تھا۔ اپنے انہی اساتذہ اور اکابر کے نقوش قدم اور خطوط زندگی کو انھوں نے اپنی زندگی کے لئے نشان راہ قرار دیا تھا۔ میں مولانا کے خردوں میں تھا۔ لیکن میں نے انھیں بہت قریب سے دیکھا، سمجھا اور ان کی زندگی کا مطالعہ کیا تھا۔ میں نے دیکھا ہے کہ ان کی زندگی میں سخت سے سخت مقام آئے، حوصلہ شکن آزمائشیں آئیں، مگر کبھی انھوں نے صبر واستقامت کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ زندگی میں پیش آنے والی ہر دشواری کا انھوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ پوری زندگی اصلاح ملت، تبلیغ دین، احقاق حق اور ابطال باطل کے لئے وقف کردی تھی۔ وہ صحیح معنوں میں اپنے عہد کے معروف مصلح ومجدد حضرت مولانا سید محمد امین نصیر آبادیؒ کے قائم مقام وجانشین تھے۔ سید نصیر آبادیؒ کے بعد پرتاپ گڈھ، سلطان پور، اعظم گڈھ اور جونپور کے دینی ومذہبی حلقے میں جو خلا واقع ہوگیا تھا، حضرت مولانا نے تاعمر اسے پر کرنے کی کامیاب کوشش کی اور اپنی ساری علمی، فکری اور جسمانی توانائی ملت اسلامیہ کی اصلاح ورہنمائی کے لئے وقف کردی۔

مدارس ومکاتب کا بچوں کی ذہنی وفکری تربیت اور دینی ومذہبی نشو ونما میں بڑا اہم کردار ہوتا ہے۔ بچے اپنی تعلیم کے بالکل ابتدائی دور میں جو ذہنی وفکری غذا حاصل کر لیتے ہیں، اس کا اثر ان پر ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ خواہ وہ پڑھ لکھ کر کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوجائیں اور وہ زندگی کے کسی شعبے سے کیوں نہ وابستہ ہوں۔ حضرت مولانا منیر احمدؒ صاحب کو اس حقیقت کا ہمیشہ ادراک رہا ہے۔ چناں چہ انھوں نے اپنی یکہ وتنہا جدو جہد سے پورے علاقے میں ابتدائی مکاتب ومدارس کے جال بچھا دئے۔ اگر انہیں وہاں کے علماء اور بعض دوسرے ارباب حل وعقد کا تعاون ملتا تو یہ کام اور وسیع پیمانے پر انجام پاتا۔ اس سلسلے میں مولانا ہمیشہ محسود رہے۔ بعض موقع شناسوں نے ان کو پیچھے ڈھکیلنے اور ان کے قد بلند کو پست کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ حاسدوں کے حسد اور بدخواہی کا عالم یہ تھا کہ مولانا کو فتویٰ اور مذہبی رہنمائی کے سلسلے میں مرجع کی حیثیت حاصل تھی، دور دور سے لوگ اپنی زندگی کے اہم مسائل میں دینی رہنمائی حاصل کرنے کے لئے ان کی خدمت میں

حاضر ہوتے تھے، میں نے دیکھا ہے بہت سے چھٹ بھیّے ان کے تحریری فتووں پر انگلی اٹھا نے کی جرأت کر لیتے تھے اور اسے متنازع بنا دیتے تھے۔لیکن مولانا بڑے صبر وتحمل کے ساتھ کتاب وسنت سے اپنی بات کی دلیل فراہم کرتے تھے۔کبھی کسی کی پرواہ نہیں کی۔ بہ قول والی آسی ؎

میں چلتا رہا سر اٹھائے ہوئے
مرا قتل ہر روز ہوتا رہا

مولانا منیر احمد یغمائیؒ علم وتفقہ کی جس بلندی پر فائز تھے، وہاں سے ان کے اکثر معاصر اور ارد گرد کے علماء ودانشور پست اور بونے نظر آتے ہیں۔خدا نے بیک وقت انہیں بہت سی خوبیوں اور صلاحیتوں سے نوازا تھا۔وعظ وخطابت ان کا مستقل مشغلہ تھا، تفسیر وحدیث میں وہ یدطولیٰ رکھتے تھے اور ایک بڑے طبقے میں وہ ''بڑے مفتی صاحب'' کے طور پر جانے جاتے تھے اور لوگ ان سے فتویٰ حاصل کرتے تھے۔ان سب کے ساتھ ساتھ وہ شعر وادب اور تصنیف وصحافت میں بھی ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔''نفیر ہدایت'' حضرت مولانا کا پہلا مجموعہ سخن ہے۔یہ مجموعہ ان کی نعتوں اور اصلاحی نظموں پر مشتمل ہے۔ ''نفیر ہدایت'' کی نظموں میں مولانا، علامہ اقبال سے بہت قریب نظر آتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی اس کتاب کے ان کی زندگی میں متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔

''**اصلاح العباد فی رسم المیلاد**'' مولانا کی وہ کتاب ہے، جس کے بارے میں مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی میاںؒ ندوی نے ایک بڑی مجلس میں فرمایا تھا کہ ''میلاد مروجہ کے رد میں اس سے بہتر کوئی کتاب اردو زبان میں میری نظر میں نہیں گزری''۔

حضرت مولانا نے ایک کتاب اپنی زندگی کے آخری دور میں ''زینۃ الفقہ'' کے نام سے تالیف فرمائی تھی۔یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل تھی۔لیکن اب تک یہ بات میرے علم میں نہیں آسکی کہ یہ کتاب شائع ہوئی بھی یا نہیں۔کاش مولانا کے ورثاء اور دوسرے متعلقین کو اس کا احساس ہو اور ایک بڑا سرمایہ ضیاع سے بچ سکے۔

بیسویں صدی کے نصف اول میں مولانا نے ''الفلاح'' کے نام سے ایک ماہانہ مذہبی

واصلاحی رسالہ بھی جاری کیا تھا۔حضرت مولانا محمد احمدؒ پھولپوری،مولانا قاری عبد الحفیظ (فاضل سبحانیہ الہ باد)اورحکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مجاز جناب مولانا نجم احسن کے اسماء گرامی اس کی مجلس ادارت میں شامل تھے۔یہ رسالہ کئی سال تک پابندی کے ساتھ نکلتا رہا۔اس میں شائع ہونے والے مضامین خصوصاً مولانا کے ادارئے معاصر رسائل وجرائد میں نقل کئے جاتے تھے۔

مولانا منیر احمد یغمائیؒ اگر چہ سیاسی مزاج نہیں رکھتے تھے اور نہ انہیں سیاسی شخصیتوں اوران کی سرگرمیوں سے کوئی دل چسپی تھی،اس لئے کہ ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت سید نصیرآبادیؒ کی تربیت گاہ میں ہوئی تھی،جس کی وجہ سے اصلاح معاشرہ اور دعوت ان کے مزاج وطبیعت میں شامل ہوگیا تھا،تاہم مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور بعض دوسرے اساتذہ سے قرب وتعلق کی وجہ سے ان کے ذہن وفکر پر جمعیۃ العلماء کے بھی کچھ اثرات تھے۔یہی وجہ ہے کہ اپنی تمام تر اصلاحی وتبلیغی سرگرمیوں کے باوجود جمعیۃ العلماء اوراس کے رجال کے خلاف وہ ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کرتے تھے۔

مولانا کسی ایسی گفتگو میں حصّہ لینے سے گریز کرتے تھے،جس میں براہ راست انہیں مخاطب نہ کیا گیا ہو۔لیکن جب انہیں کسی گفتگو میں حصّہ لینا ہی پڑ جاتا تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے دکھا دینا ان کا خاص کمال تھا۔جب اور جس موضوع پر گفتگو کرتے سامع کواس کی تہہ تک پہونچانے کی کام یاب کوشش کرتے۔ان کی جرأت وبے باکی کا ایک واقعہ خصوصیت کے ساتھ سنانا چاہوں گا:

''ایک بار وہ اپنے کچھ عقیدت مندوں سے ملنے کے لئے ٹاٹا جمشید پورتشریف لے گئے،مغرب کے وقت میزبان نے کہا حضرت! ہم لوگ یہیں گھر پر جماعت کرلیں گے،اس لئے کہ مسجد میں دوسرے نظریئے کے امام ہیں،وہ آپ کوامامت کا موقع نہیں دیں گے،یہ بات ہم سب کے لئے ناقابل برداشت ہوگی۔مولانا نے فرمایا: یہ بات تو درست ہے کہ جب وہ امام ہیں تو امامت وہی کریں،لیکن آپ لوگوں نے یہ کیسے طے کرلیا کہ وہ مجھے امامت کا موقع نہیں دیں گے؟لوگوں نے کہا چوں کہ وہ دوسرے نظریئے کے علماء کو

پسند نہیں کرتے، اس لئے یقین ہے کہ وہ آپ کو موقع نہیں دیں گے۔ مولانا نے فرمایا: چلئے آپ لوگ مسجد ہی چلیں، ان شاء اللہ وہیں نماز ادا ہو جائے گی۔ چنانچہ سب لوگ مسجد پہنچے، اس وقت اذان ہو رہی تھی، امام صاحب وضو فرما رہے تھے، مولانا جا کر مصلّے پر بیٹھ گئے، اذان کے بعد صف بندی کرانا شروع کر دی۔ امام صاحب نے بڑی آہستگی سے کہا آپ پہلے سے مصلے پر کھڑے ہو گئے، امام تو میں ہوں۔ چوں کہ وہ امام صاحب عالم دین نہیں تھے۔ ناظرہ خواں تھے اور اردو کی معمولی نوشت وخواند کی صلاحیت رکھتے تھے۔ مولانا کو یہ بات معلوم تھی۔ مولانا نے فرمایا: عزیزم! عالم میں ہوں، حافظ میں ہوں، قاری میں ہوں اور الحمد للہ مفتی بھی ہوں، روزانہ درجنوں فتاوی میرے پاس آتے ہیں۔ الحمد اللہ تمہارے لباس سے میرے لباس بھی اچھے اور عمدہ اور صاف ستھرے ہیں، شکل میں بھی الحمد للہ تم پر فوقیت رکھتا ہوں۔ اس کے بعد ڈیڑھ دو منٹ میں مصلے پر کھڑے ہو کر فقہ میں درج امامت کی شرائط بیان کیں اور مقتدیوں کو مخاطب کر کے پوچھا کہ ان صورتوں میں بتایئے کون احقّ امامت ہے؟ تمام مصلیوں نے بہ یک آواز کہا: حضرت آپ ہی امامت فرمائیں۔ چنانچہ آپ نے نہایت خوش آوازی کے ساتھ اور پر کیف انداز میں نماز پڑھائی۔ اس واقعہ سے مولانا کی جرات و بے باکی کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور خود اعتمادی اور اصابت رائے کی بھی۔

جیسا کہ گزشتہ سطور میں کہیں عرض کر چکا ہوں کہ مولانا یغمائیؒ شعر وادب سے گہرا شغف اور دلچسپی رکھتے تھے۔ اردو شاعری میں وہ اقبال ہی کے اشعار کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ اپنی تقریروں اور تحریروں میں بھی وہ اقبال ہی کے اشعار استعمال کرتے تھے۔ دراصل اقبال ان کے مزاج میں رچے بسے ہوئے تھے۔ ایک روز فرمانے لگے! جب کبھی مجھے شعری غذا کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو میں صرف اقبال کو پڑھتا ہوں۔ کلیات اقبال کو ہمیشہ قریب رکھتا ہوں، یا پھر اپنا مجموعہ کلام ''نفیر ہدایت'' نکال کر کوئی نظم گنگنانا شروع کر دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر انھوں نے الماری سے اپنا شعری مجموعہ نکالا اور فرمایا! میاں تم بہت اچھا پڑھتے ہو، جب تم پڑھتے ہو تو میں روحانی تسکین محسوس کرتا ہوں، لو اس میں سے کوئی

نظم یا نعت سناؤ، میں تمھارے اور وکیل صاحب کیلئے چائے بنواتا ہوں۔ میں نے تعمیل حکم میں شروع کی ایک نعت سنائی۔ ہر شعر کئی کئی بار پڑھواتے اور جھومتے رہے۔ سبحان اللہ اور جزاک اللہ بھی کہے جا رہے تھے۔ جب میں نے یہ شعر پڑھا۔

گنہ گار امت ہے شاداں یہ سن کر

شفاعت پہ مامور روزے جزا ہو

تو ان پر وجدانی کیفیت طاری ہوگئی۔ اسے کئی بار پڑھوایا۔ میرے ساتھ خود بھی گنگناتے رہے۔ یہ انھی کا شعر تھا اور بہت سادہ سا شعر تھا۔ انکی متذکرہ صورت حال سے بہ آسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ شعر برائے شعر کے قائل نہیں تھے، بلکہ جو کچھ کہتے تھے ڈوب کر، سمجھ کر اور اس کی حلاوت و کیفیت سے پورے طور پر سرشار ہو کر کہتے تھے۔

مولانا یغمائیؒ اپنے دوستوں اور ملنے والوں سے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ اور ٹوٹ کر ملتے تھے۔ کوئی علم اور مرتبے میں ان سے کتنا ہی کم درجے کا کیوں نہ ہو، ہمیشہ اسے عزت و احترام سے سرفراز کرتے تھے۔ البتہ اپنی عالمانہ شان کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے۔ بڑے سے بڑے عالم و فاضل یا اپنے وقت کا رئیس اعظم یا کوئی حاکم و افسر، وہ ہر ایک سے کامل عالمانہ رکھ رکھاؤ اور درویشانہ شان بے نیازی کے ساتھ ملتے تھے۔

مولانا منیر احمد یغمائیؒ: ۱۹۰۴ء میں ضلع پرتاپ گڈھ کی ایک دور دراز بستی ''دیولی'' متصل ''صاحب گنج بازار'' میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محترم الحاج محمد سلطان صاحب علاقے کے معزز زمین داروں میں تھے۔ انھوں نے اپنے لائق بیٹے کو اس غرض سے عالم بنایا اور اسے دینی تعلیم سے آراستہ کیا تھا کہ وہ دین کی توسیع و اشاعت کی خدمت انجام دے گا اور ان کے مرشد حضرت مولانا سید محمد امین نصیر آبادی کے نقش قدم پر چل کر اصلاح معاشرہ اور تبلیغ اسلام کا فریضہ انجام دے گا۔ مولانا کے سامنے والد محترم کی یہ خواہش ہمیشہ رہی اور پوری عمر انھوں نے اس کا پاس و لحاظ رکھا۔ مولانا نے ۱۹۷۶ء میں ۷۲ رسال کی عمر گزار کر بہ حالت سفر بمبئی میں وفات پائی اور ان کے دیرینہ رفیق و عزیز حضرت مولانا شاہ محمد یار صاحب رحمۃ اللہ علیہ پرتاپ گڈھی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ مولانا محمد یارؒ

صاحب نے نماز سے پہلے لوگوں کو مخاطب کر کے مولانا کے علمی تبحر، انکی دینی و ملّی خدمات اور ایثار و قربانی کی شہادت دی۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ (تذکرہ علماء پرتاپ گڑھ)

مولانا عبدالقدوسؒ اعظمی

حضرت مولانا عبدالقدوس اعظم گڈھ کے مشہور قصبہ ''جگدیش پور'' کے رہنے والے تھے۔ مدرسہ حفظ العلوم ڈروا میں تدریسی خدمت کے لئے تشریف فرما ہوئے اور یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ مولانا عبدالقدوس صاحب سے پہلے اس منصب پر مولانا محمد یار صاحب تھے۔ مولانا محمد یار صاحب نے ڈروا کے زمانۂ تدریس میں ہی اپنے اصلاحی مشن کا کام شروع کر دیا تھا اور اصلاح المسلمین تنظیم کا قیام بھی عمل میں آچکا تھا۔ اہل ڈروا مولانا سے والہانہ محبت رکھتے تھے۔ خود حضرت مولانا عبدالقدوس و مولانا محمد یار صاحب یک جان و دو قالب کے مثال تھے۔ چنانچہ مولانا عبدالقدوس صاحب ہر محاذ پر مولانا کے ساتھ ہوا کرتے۔ مولانا عبدالقدوس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات سے ڈروا، بابوگنج اور پاس پڑوس کے علاقہ میں دینی و اصلاحی کام کو بہت فروغ ہوا۔ اس علاقہ کے اکثر علماء و حفاظ حضرت والا ہی کے شاگرد و تربیت یافتہ ہیں۔

حافظ مولوی شبیر احمدؒ اعظمی صاحب لکھتے ہیں:

والد صاحب ایک متبحر عالم، قابل استاذ، عمدہ مقرر اور مناظر نیز ایک ماہر طبیب تھے۔ والد المرحوم کی زندگی کا اصل اور قیمتی حصّہ یہیں قصبہ ''ڈروا'' پرتاپ گڈھ میں گزرا؛ جہاں پر قیام پذیر ہوکر موصوفؒ نے ''مدرسہ عربیہ حفظ العلوم'' کی بے لوث خدمت کی اور ادارے کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا اور وہیں پر سپرد خاک ہوئے۔ آپ سے فیض حاصل کرنے والے علماء و حفاظ کی ایک بڑی تعداد آج بھی موجود ہے۔ والد صاحب حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شاگردوں میں سے تھے اور بیعت و ارادت کا تعلق حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ سے رکھتے تھے۔ نیز جمعیۃ العلماء کے سرگرم کارکن تھے۔

پیدائش اور تعلیم:

والد صاحبؒ کی تاریخ پیدائش باوجود کوشش اور سعی کے صحیح طور پر معلوم نہ ہوسکی۔ موصوف کی بسم اللہ اور ابتدائی تعلیم ناظرہ اور حفظ قرآن حافظ ولی اللہ صاحبؒ (جو اس علاقے میں حافظ اولیاء کے نام سے مشہور تھے اور واقعی ولی صفت تھے) کے ہاتھوں ہوئی۔ حفظ تک کی تعلیم آپ نے وطن میں ہی مکمل کی اور محراب سنائی۔ بعدہ میرے نانا جان حاجی عنایت اللہ نیز بڑے والد منشی حاجی عبدالرحمٰن کی کوششوں سے موصوف کی فارسی شروع کرائی گئی۔ درس نظامیہ کی تکمیل کے لئے آپ دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے حلقہ درس میں شامل ہوئے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں کی صف میں جگہ پائی۔ جنگ آزادی کا دور شروع ہو چکا تھا۔ روزانہ بڑے بڑے جلسے اور بڑی بڑی کانفرنسیں ہوا کرتی تھیں۔ خاص طور سے لیگ اور کانگریس کے درمیان خوب گہما گہمی رہتی تھی۔ چند وجوہ کی بناء پر حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ دارالعلوم دیوبند سے علاحدہ ہوکر جامعہ اسلامیہ عربیہ ڈابھیل سورت (گجرات) منتقل ہو گئے۔ حضرت کے ساتھ والد المرحوم بھی ڈابھیل چلے گئے اور صحاح ستہ کی تعلیم وہیں مکمل کی اور وہیں سے فارغ بھی ہوئے۔ آپ کی سند پر حضرت علامہ مرحومؒ اور مولانا یوسف بنوریؒ کے دستخط ہیں۔ تاریخ وسن فراغت ۱۵ر شعبان ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۶ء ہے۔

زندگی کے نشیب وفراز:

قصبہ ڈروا میں والد صاحب کی تدریسی و دینی مشغولیت میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا گیا۔ قصبے کی مشہور شخصیت منشی رفیع الزماں مرحومؒ کے پختہ مکان کا ایک کمرہ والد صاحب کی رہائش کے لئے منتخب کیا گیا۔ یہ وقتاً فوقتاً متعدد علماء کرام کی رہائش گاہ رہی ہے۔ قصبہ ڈروا میں جو بھی نو وارد مسافر یا کوئی سفیر آیا کرتا تھا؛ وہ منشی جی مرحوم کا مہمان ہوکر رہتا اور ان کی ہر ممکن خدمت کی جاتی تھی۔ مدرسہ ہٰذا کی تدریسی خدمت بمشاہرہ ساٹھ روپئے فی ماہ حضرت والد صاحب کے سپرد کی گئی۔ منشی جی مرحوم کے یہاں کھانے کا نظم ہوا۔ جامع مسجد کی امامت بھی سپرد کی گئی۔ اس طرح مدرسہ کی ترقی کا دروازہ کشادہ ہوا۔

حضرت والدؒ صاحب سے قبل حضرت مولانا محمد یار صاحبؒ جو کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے بیک واسطہ خلیفہ اوران کے شاگرد خاص تھے۔ دارالعلوم دیو بند سے فراغت حاصل کی تھی۔ بڑے ہی ذاکر وشاغل متقی لوگوں میں سے تھے، دریائے علم کے شناور تھے۔ زبان میں مٹھاس، بات میں اثر، بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ وہ مدرسہ ہٰذا کی تدریسی خدمت انجام دیرہے تھے۔ تھوڑے عرصے کے بعد موصوف ''کنٹھ مالا'' کے عارضہ میں مبتلا ہوگئے؛ جسکی وجہ سے مدرسہ کی ذمہ داری سے سبکدوش ہوکر اپنے وطن ''اوگئی پور'' تشریف لے گئے۔ موصوف کے رعب اور محبت دونوں کا تذکرہ کرنے سے راقم کی زبان قاصر ہے۔ راقم کی جانب حضرت کو اس قدر میلان تھا اور اس قدر ناچیز سے حسن ظن رکھتے تھے کہ ان کے حسن ظن اور محبت کو راقم اپنے لئے ذخیرۂ نجات سمجھتا ہے۔ ناچیز کو وہ پیار سے ''بھیّہ'' کہہ کر پکارتے تھے اور تھوڑے دن اگر خیریت نہیں ملتی تھی تو احقر کی خیریت کے لئے بےچین ہوجایا کرتے تھے۔ راقم کا مشغلہ دواؤں کا ہے؛ اگر کبھی راقم نے کوئی معمولی سی دوا حضرت کے حوالہ کردی، جس کی کوئی خاص تاثیر نہ تھی؛ تاہم جب حضرت سے دریافت کیا جاتا کہ کچھ آرام ہے، تو اس قدر دعاؤں سے نوازتے اور ہمت افزائی کے کلمات کہتے کہ چاہے کسی کا مرض دور ہو یا نہ ہو، راقم کا مرض ضرور دور ہوجایا کرتا تھا۔

جان کر منجملہ خاصان میخانہ تجھے
مدتوں رویا کرینگے جام وپیمانہ تجھے

بہر حال والد صاحبؒ کی تقرری حضرت مولانا محمد یار صاحبؒ کی جگہ ہوگئی۔ اور ''ڈروا'' واطراف ڈروا سے کثیر تعداد میں طلباء مدرسے میں داخل ہونا شروع ہوگئے۔

شب وروز کی مشغولیت:

فجر بعد ہی طلباء کے اسباق شروع ہوجایا کرتے تھے۔ ناشتے کا وقت ہونے تک حفظ کے طلباء سبق لے لیا کرتے تھے۔ ناشتے کے فوراً بعد والد صاحبؒ مدرسہ تشریف لے جاتے اور تقریباً بارہ بجے قیلولہ، بعدۂ ظہر پڑھ کر، پھر مدرسے کے اسباق شروع کرتے اور یہ سلسلہ عصر تک چلتا رہتا۔ عموماً شام کو کہیں دعوت ہوجاتی تو شام ہی کو چار پانچ کلومیٹر کا سفر

بھی کرتے اور رات کے وقت ہی واپس آجاتے اور پھر بعد فجر مدرسہ جاری ہوجاتا۔ والد صاحب کی سختی مشہور تھی۔ تاہم بڑی عمر کے بالغ طلباء کئی کئی کلومیٹر کا سفر کرکے آتے اور زانوئے ادب تہہ کرتے اور علم حاصل کرنے میں دریغ نہ کرتے۔

یہ علاقہ خاص طور سے (بلکہ پورا پرتاپ گڈھ) حضرت مولانا سید محمد امین نصیرآبادیؒ کے شاہی دوروں، مجاہدانہ کارناموں اور بے انتہا جدو جہد کا علاقہ رہ چکا ہے۔ حضرت کی محنتوں کے ثمرات آج بھی اظہر من الشّمس ہیں۔ حضرت جہاں بھی رونق افروز ہوئے شرک وبدعت کا صفایا ہوگیا۔ علماء کرام کی قدر عوام میں پیدا ہوئی۔ لوگ اپنی پچھلی بے ڈھنگی زندگی سے تائب ہوکر دین اسلام کے احکامات کی پابندی کی طرف مائل ہوئے۔ بڑے بوڑھوں اور بزرگوں کی جو جھلک حضرت والد صاحبؒ کے در و میں دکھائی پڑ رہی تھی، اسے حضرت نصیرآبادی ہی کی دعاؤں کے اثرات، ان کی توجہات اور ان کی محنتوں کا ثمرہ کہا جاسکتا ہے۔

بہار یہ جو گلشن میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود اُنہیں کی لگائی ہوئی ہے

والد صاحبؒ بھی عوام میں کافی مقبول ہوئے۔ لوگ سواریوں پر چلتے چلتے ٹھہر جاتے اور دوڑ کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے اور ہاتھ سینوں پر رکھتے، خیریت دریافت کرکے آگے بڑھتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شادی، بیاہ کے معاملات، نکاح وفسخ نکاح کے معاملات، آپس کی رنجشوں میں صلح وصفائی کے معاملات، توبہ کے معاملات کے لئے نیز وعظ وتقریر کے لئے والد صاحبؒ مدعو کئے جاتے اور جن کے معاملات ہوتے وہ اپنی اپنی تاریخیں لیتے۔ گو یا یہ ایک شرعی عدالت کا قیام تھا، جس کے لئے مستقل جدوجہد چل رہی تھی۔ اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ شام کو مدرسہ کی تدریس کے فوراً بعد سواری سے مطلوبہ مقامات پر جانا ہوتا۔ رات میں معاملات کو حل کرکے اُسی وقت یا علی الصباح واپسی ہوجاتی۔ کبھی کبھی صاحب معاملہ کو جائے قیام پر ہی بلایا جاتا اور وہیں پر مسائل حل کئے جاتے۔ کبھی کبھی جب معاملات طول پکڑ جاتے، تو اس کے حل کرنے میں حضرت مولانا محمد یار

صاحبؒ اور کچھ مخلصین کو ساتھ لیتے اور الجھی تھی کو سلجھانے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔دعوت دینے والے کے متعلق اگر کسی نے شرعی قباحت کا ذکر کیا،تو بغیر توبہ کے اس کے یہاں کھانا نہیں کھاتے تھے۔ یہ سلسلہ کبھی کبھی مہینوں مسلسل چلتا رہتا تھا،اور اگر سفر درپیش ہوتا تو جائے قیام پر درس وتدریس نیز علمی مجالس کا سلسلہ دس بجے رات تک چلتا رہتا۔

حضرت والد صاحبؒ ہی کے دور میں مدرسہ عربیہ حفظ العلوم کا شعبۂ نسواں قائم ہوا اور بچیوں کی تعلیم الگ سے ہونے لگی،اس کے لئے معلمات کی تقرّری ہوئی بعدہٗ شعبۂ پرائمری اور دینیات کو بھی علاحدہ کیا گیا اور معلمین کی تقرّری ہوئی۔ جب مدرسہ میں جگہ کی تنگی درپیش ہوئی تو تعمیر نو کا سلسلہ قائم ہوا اور سہ منزلہ عمارت کی بنیاد ڈالی گئی۔ چندہ کی فراہمی کے سلسلے میں والدؒ صاحب کے کئی اسفار ہوئے،شب وروز کی دوڑ دھوپ ہوتی رہی، بالآخر تعمیر مکمل ہوئی۔اسی طرح جامع مسجد ڈروا کی تعمیر کی ابتدا مخلصین کی جدوجہد سے شروع ہوئی۔والد صاحب بھی برابر فکر مند رہے،درمیان میں حالات دگرگوں ہوتے رہے،مسجد کی تعمیر بند ہوگئی، بڑی بڑی رکاوٹیں سامنے آئیں؛لیکن قصبے کے لوگوں کی محنت اور لگن رنگ لائی اور تعمیر مکمل ہوئی۔مدرسے کی کوئی مستقل آمدنی چندے کے علاوہ نہ تھی؛لہٰذا چندے کے سلسلے میں حضرت والد صاحبؒ ہر سال بمبئی وغیرہ کا سفر رمضان المبارک میں کیا کرتے تھے۔ان شہروں میں والد صاحبؒ نے کوشش کی کہ ماہ بماہ مدرسے کو کچھ رقم ملتی رہے۔الحمد للہ اہل خیر حضرات متوجہ ہوئے اور ایک ایک کھولی (روم) مدرسے کے نام وقف کردی اور اس کی آمدنی ادارے کو آنا شروع ہوگئی۔

دور اختلاف:

شیطان ملعون دینی جدوجہد کے اندر رکاوٹ ڈالا ہی کرتا ہے۔کچھ شرپسند عناصر والد صاحبؒ کے پیچھے پڑے،والد صاحبؒ کو قصبے سے نکالنے کی مہم چلائی،والد صاحبؒ قصبہ چھوڑنے کے لئے تیار بھی ہوگئے؛لیکن اکثریت مدرسے کی ترقی چاہ رہی تھی۔احباب کو کسی قیمت پر والد صاحب کی علاحدگی برداشت نہیں تھی۔ڈروا میں دو پارٹیاں ہوچکی تھیں۔والد صاحبؒ مغموم رہنے لگے۔کچھ قصبہ والوں کی بے حسی پر، کچھ اختلاف کو دیکھ کر۔فارسی

وعربی کے طلباء کی تعداد کم ہوگئی۔ تاہم تعلیم جاری رہی۔

کچھ مخالفت کے اور کچھ فکرمندی کے باعث والد صاحب کی صحت کمزور ہونے لگی، عمر تقریباً ۶۵ر سال گزر چکی تھی، بیماری کا سلسلہ شروع ہوا تو تقریباً ۵ر سال تک طول پکڑتا چلا گیا۔ لیکن بیماری کی صحیح تشخیص اس وقت ہو پائی، جبکہ والد صاحبؒ کو چلنے پھرنے اور نشست و برخاست میں دشواری پیش آنا شروع ہوئی۔ والد صاحبؒ مرض ذیابیطس میں مبتلا ہو چکے تھے اور مرض اس قدر حاوی ہو چکا تھا کہ مستقل علاج و پرہیز کی ضرورت تھی۔ پھر بھی جتنا ممکن ہوسکا علاج ومعالجے کی کوشش کرتے رہے۔ مدرسے کی خدمت میں پوری معاونت حضرت مولانا نسیم اللہ مظاہری کر رہے تھے۔ بالآخر راقم نے والد صاحبؒ کی جانب سے استعفی نامہ لکھا اور جمعہ کے روز ممبر کے پاس کھڑے ہوکر استعفی نامہ پڑھا اور والد صاحبؒ کی سبکدوشی کا اعلان کر دیا پھر استعفی نامہ ممبر پر رکھ کر چلا آیا۔ کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

تاریخ وفات: ۱۵ر جمادی الآخر ۱۴۰۵ھ مطابق ۸ر مارچ ۱۹۸۵ء ہے۔

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

حضرت والد صاحبؒ کا سایہ اٹھ جانے کے بعد مدرسے کے لئے ایک سرپرست کی ضرورت محسوس کی گئی؛ کہ بغیر سرپرستی کے عموماً دینی مدارس میں تعلیم اور انتظام صحیح طور پر چلنا مشکل ہوتا ہے۔ اس کے لئے پورے قصبے کی پنچایت بلائی گئی۔ مدرسہ نسواں کے اندر غور خوض ہوتا رہا۔ آپس میں تبادلہ خیالات کے بعد متفقہ طور پر فیصلہ ہوا کہ مدرسے کی باگ ڈور حضرت مولانا محمد یار صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ چنانچہ مولانا کو مدرسہ کا متفقہ سرپرست قرار دیا گیا اور اس کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ حضرت مولاناؒ تاحیات مدرسے کے سرپرست رہے اور گاہے بگاہے مدرسے میں قدم رنجہ فرما ہوکر پوری رہنمائی بھی کرتے رہے اور اپنی ذمہ داری کو بخوبی نبھاتے رہے۔ کچھ اختلافات حضرت کے دور میں بھی سر اٹھاتے رہے؛ لیکن حضرت پوری جواں مردی سے اس کو جھیلتے رہے، مخالفین کو مطمئن

کرنے کی کوشش کرتے رہے اور مدرسہ بدستور جاری وساری رہا۔

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں بلبلیں
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گی

زندگی کے چند اہم واقعات

سلیم پور بھداری کا اہم مناظرہ:

والد صاحبؒ قصبہ ڈروا آچکے تھے اور ان کی تدریسی خدمات کا دور شباب پر تھا۔ عین اسی وقت ایک اہم مناظرے کی نوبت آگئی۔ پرتاپ گڈھ ضلع کا ایک مشہور ومعروف قصبہ ''بابوگنج'' ہے۔ یہاں سے بجانب مغرب تقریباً ۲ رکلومیٹر کے فاصلے پر ''سلیم پور بھداری'' ایک گاؤں ہے۔ وہاں پر مولوی حشمت علی رضاخانی ایک بار آگیا۔ رات کے بیان میں اکابر دیوبند کے خلاف خوب زہر اگلتا رہا اور جو کچھ زبان پر سخت وسست آیا، اسے کہنے میں دریغ نہیں کیا۔ اس مجلس میں کچھ صحیح العقیدہ مسلمان بھی جاکر پھنس گئے تھے۔ صبح ہوتے ہی وہ حضرات والد صاحبؒ کے پاس آئے اور کہا کہ مولانا! ہم نے حشمت علی کو روک رکھا ہے۔ آپ چلئے اور انکی بیہودہ گوئی کا جواب دیجئے، نیز سوالات بھی رکھئے، کہ اس طرح کی تقریر پر کونسا اجر وثواب اللہ کی جانب سے دیا جائے گا؟ والد صاحبؒ تیار ہوگئے، دوسری جانب سے حضرت مولانا محمد یار صاحبؒ بھی مع احباب تشریف لے گئے۔ پہلے والد صاحبؒ نے تقریر کی، اس کے بعد حشمت علی نے جو کچھ رات میں فضولیات بکے تھے ان کے جوابات دیئے۔

منجانب اللہ اتفاقاً اس وقت ڈروا میں حضرت مولانا کاظم علی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ اپنے دعوتی اور تبلیغی دورے پر تشریف لائے ہوئے تھے۔ حضرت مولانا کے سامنے جب مناظرے کی بات رکھی گئی تو انھوں نے فرمایا: میں اس کو خوب جانتا ہوں اور کئی بار اس سے الجھ چکا ہوں۔ اگر وہ میرا نام سن لیگا، تو سامنے نہیں آئیگا۔ لوگ مصر ہوگئے کہ حضرت آپ بھی تشریف لے چلیں۔ حضرت مولانا راضی ہوگئے۔ جس وقت مولانا میرٹھیؒ مناظرہ گاہ میں

پہنچے ہیں؛اس وقت مولوی حشمت علی کی جانب سے ایک پرچے پر کچھ سوالات علماء کرام کے پاس بھیجے گئے تھے اوراس کا جواب طلب کیا گیا تھا۔مولانا محمد یار صاحبؒ ان سوالات کے جوابات لکھنے جارہے تھے کہ مولانا کاظم علیؒ میرٹھی شیر کی طرح گرجے کہ ''مناظرہ آمنے سامنے ہوگا۔جوابات آمنے سامنے دئے جائیں گے۔مناظرہ تحریری نہیں؛ بلکہ تقریری ہوگا۔اس کو (حشمت علی) کو کہدو کہ سامنے آکر سوال وجواب کرے''۔تھوڑی دیر میں معلوم ہوا کہ مولوی حشمت علی بیمار ہیں اوران کو دست آنے شروع ہوگئے ہیں اور دیکھا بھی گیا کہ لوٹا لیکرکئی بار استنجے کے لئے آئے اور گئے۔مناظرے کی مجلس میں آنے کی ہمت نہیں ہوئی اس طرح مناظرہ ختم ہوگیا۔اس وقت کسی نے یہ شعر پڑھا۔

شجاعت ختم ہے مولیٰ علیؓ پر
ضلالت ختم ہے حشمت علی پر

نیا جال لائے پرانے شکاری:

مدرسہ عربیہ حفظ العلوم کی شہرت شباب پر تھی۔مدرسہ اپنی تابانیوں کے ساتھ خدمت دین کا فریضہ ادا کررہا تھا۔اسی وقت قصبے کی سرزمین پرنااتفاقیوں کے بیج بودئے گئے اورایک نیا مدرسہ حفظ العلوم نمبرایک کے نام سے قائم ہوگیا۔قصبے میں دوپارٹی ہوگئی۔لہٰذا دو مدرسے ہونے ضروری تھے۔ڈاکٹر جمیل انصاری مرحوم کے قلم سے ایک اشتہار شائع ہوا اوراس میں ایک مختصر مضمون ''نیا جال لائے پرانے شکاری'' کے عنوان سے شائع کیا گیا۔ جس میں نئے مدرسے کی حقیقت اوراختلاف کرنے والے حضرات کی ریشہ دوانیوں کی طرف ایک تنقیدی اشارہ کیا گیا تھا۔پھر کیا تھا والد صاحبؒ کے اوپر ہی پورے طور پر سارے الزامات عائد کرتے ہوئے ان کے اوپر مقدمہ دائر کرنے کی فریق مخالف کی طرف سے پوری تیاری کر لی گئی۔اس مقدمے میں ۱۷/سترہ ملزمان کے اوپر جرم عائد کیا گیا۔جس میں ملزم نمبر ۱-حضرت والد صاحبؒ تھے اورملزم نمبر ۱۷/سترہ-الٰہ آباد کا ایک طالب علم حافظ محمود احمد (جو ہاتھ پیر سے معذور تھا اوراس وقت مدرسے میں حفظ کررہا تھا) خصوصیت سے ملزم بنائے گئے۔مدعی کو اپنے اوپر ناز تھا کہ اس طرح میں ان

حضرات سے جو مدرسہ عربیہ حفظ العلوم قدیم کے اراکین ہیں، ان سے بدلہ لے لوں گا۔ گویا جو احباب میرے نظریات کے مخالف ہیں اور مولانا عبدالقدوسؒ (جو کہ ایک پردیسی آدمی ہیں) کا ساتھ دیر ہے ہیں، انہیں پریشانی میں مبتلا کیا جائے۔ مقدمہ چلتا رہا۔ کچھ لوگوں کی حاضری معاف ہوگئی، لیکن والد صاحبؒ نے اپنی حاضری معاف نہیں کروائی اور برابر پیشی پر جاتے رہے۔

ضلع پرتاپ گڈھ کی عدالت میں مسلم وکلاء کی اچھی خاصی تعداد اسوقت موجود تھی، خصوصاً حاجی رمضان علی ایڈوکیٹ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ان وکلاء حضرات کو یہ بات پسند نہیں آئی کہ ایک عالم دین اور مدرسہ کو بدنام کرنے کے لئے اس طرح کا جھوٹا پروپگنڈہ کیا جائے اور خواہ مخواہ مقدمے کو طول دیا جاتا رہے؛ لہذا ان وکلاء حضرات نے بھی طے کر لیا کہ مدرسے کی جانب سے ایک مقدمہ مدّعی کے اوپر دائر کیا جائے، تاکہ وہ بھی سمجھ سکیں کہ میں کتنے پانی میں ہوں۔ تیاری مکمل ہوچکی تھی؛ لیکن نہ جانے مدّعی کو کس طرح اس مقدمے کی بابت معلومات ہوگئی، گھبرا کر مدّعی نے مقدمے کی پیروی ترک کردی اور چند پیشیوں کے بعد مقدمہ عدم پیروی میں خارج ہوگیا۔

قصبہ ڈروا کی تاریخی پنچایت:

ضرورت کے تحت جامع مسجد ڈروا کو شہید کر کے اس کی تعمیر جدید ہو رہی تھی۔ کام تیزی سے ہو رہا تھا۔ دونوں طرف کے کمروں اور مشرق کی جانب کے برآمدے کا سلیپ پڑ چکا تھا۔ صرف اندرونی ہال کا سلیپ باقی تھا۔ اس وقت قصبے میں دو پارٹیاں ہوگئیں اور دونوں اس بات پر آمادہ ہوئیں کہ ہم نصف کام اپنی جانب سے کرائیں گے اور نصف کام دوسری پارٹی کرائے گی۔ ظاہر ہے کہ حق پر ایک ہی پارٹی ہوتی ہے، اس وقت ڈروا میں حاجی محمد یوسف صاحب مرحوم زندہ تھے اور ایک پارٹی کے سرغنہ تھے؛ موصوف مولانا نسیم اللہ صاحب مظاہری کے دادا ہوتے ہیں۔ علم دوست اور عالم دوست شخصیت کے مالک تھے۔ والد صاحب سے گہری عقیدت رکھتے تھے، گویا والد صاحب کے دست راست تھے۔ مسجد و مدرسہ و دیگر کار خیر کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ انھوں نے

دیکھا کہ دوسری پارٹی دعویٰ تو کرتی ہے کہ ہم مسجد کی تعمیر میں حصہ لیں گے؛ لیکن ایک اچھی خاصی رقم دبائے ہوئے ہے۔ مسجد کا کام بند ہوگیا ہے اور بار بار یاددہانی کے باوجود مسجد کے تعمیری کام میں دلچسپی نہیں لے رہی ہے۔ لہٰذا حاجی صاحب مرحوم نے گیارہ گاؤں کی پنچایت جمع کرنے کا مشورہ کیا اور اس کے لئے متحرک ہوئے۔ اس وقت مسلمانوں کے گیارہ گاؤں کی ایک سماجی اکائی (شوشل یونین) بنی ہوئی تھی۔ کوئی اہم مسئلہ درپیش ہوجانے پر گیارہ گاؤں کو یاد کیا جاتا تھا۔

وقت مقررہ پر پنچائت کا آغاز ہوا۔ حضرت مولانا محمد یار صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس پنچائت کے صدر اور فیصل بنائے گئے۔ جامع مسجد کے عقب میں بجانب مغرب بہت بڑا مجمع بعد عشاء متفکر ہوکر بیٹھا۔ دونوں پارٹیوں نے اپنی اپنی بات رکھی۔ بظاہر یہی معلوم ہورہا تھا کہ اختلاف کچھ نہیں ہیں۔ سب کے سب مسجد کی تعمیر کے لئے تیار ہیں۔ لیکن مولانا موصوفؒ دل ہی دل میں بے چین تھے کہ کوئی اختلاف نہ ہونے کے باوجود مسجد کا کام کیوں نہیں ہورہا ہے؟ اور لوگ متحد کیوں نہیں ہورہے ہیں؟ فریق ثانی پیسہ کیوں نہیں لگانا چاہتا؟ اخیر میں قصبہ ڈروا کی ایک فکرمند شخصیت منشی عبدالخالق مرحوم کھڑے ہوئے اور انھوں نے حضرت مولانا کو مخاطب کرکے ہندی کے کچھ ''دوہے'' پڑھے۔ اور یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ فریق ثانی مسجد کی تعمیر کے لئے حامی تو بھر رہا ہے؛ لیکن آپ کے چلے جانے کے بعد نیز پنچایت ختم ہونے کے بعد اپنی رفتار بے ڈھنگی اور خودغرضی پر آجائے گا۔ حضرت مولاناؒ اس بات کو سمجھ رہے تھے۔ انھوں نے منشی جی مرحوم کو بیٹھ جانے کا حکم دیدیا۔ اخیر میں جب پنچوں کو کھانا کھانے کی دعوت دونوں جانب سے پیش کی گئی، تو حضرت مولاناؒ فوراً کھڑے ہو گئے اور پرزور الفاظ میں گویا ہوئے کہ ''اگر آپ لوگوں کو پنچوں کو کھانا کھلانا ہی ہے، تو کیوں نہیں آپس میں صلح وصفائی کرکے اپنے دلوں کے میل صاف کرکے نیز متحد ہوکر کھانا کھلاتے۔ اس طرح سے دو پارٹیوں کے رہتے ہوئے پنچوں کو کھانا کھانے میں زیادہ تکلیف ہوگی''۔ بات کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ مجلس میں سناٹا چھا گیا اور دس منٹ تک کوئی نہیں بولا۔ لیکن اللہ کے فضل نے رہنمائی کی اور دونوں پارٹیوں میں صلح ہوگئی۔ پنچوں

نے ۴ ؍بجے شب میں کھانا کھایا اور جلد ہی مسجد کا تعمیری کام شروع ہو گیا۔ اور مسجد الحمد للہ مکمل ہو گئی۔

دور ایمر جنسی کے خطرات:

۱۹۶۷ء کا دور تھا۔ اس وقت کی خاتون وزیر اعظم آنجہانی اندرا گاندھی نے ملک میں ایمر جنسی نافذ کر رکھی تھی اور جس کو جس کو محترمہ نے اپنی پارٹی اور اپنی کرسی کا مخالف سمجھ رکھا تھا، ان سب کو جیل میں ٹھونس دیا تھا۔ زبان بندی، قلم بندی اور نس بندی تینوں قانون کو لاگو کرنے کی بھرپور کوشش کی جا رہی تھی۔ اس کے لئے سارے ملک کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً ٹارگیٹ بنایا گیا۔ فیملی پلاننگ اور برتھ کنٹرول کو جبراً اور قانوناً نافذ کرنے کی پرزور سرکاری تحریک چلائی گئی۔ علماء کرام کے پاس (ڈی، ایم۔ ایس، پی اور سی، آئی، ڈی) کی گاڑیاں دوڑنے لگیں اور ان سے فیملی پلاننگ کی تائید میں کچھ کہلوانے اور بیانات دینے کی کوشش کی جانے لگی۔

حکومت کو بھی اندازہ ہو گیا کہ مسلم عوام علماء کرام سے مربوط ہیں۔ جب تک علماء کرام برتھ کنٹرول اور فیملی پلاننگ کی تائید میں فتویٰ نہیں دیں گے؛ اس وقت تک مسلم عوام اس جانب توجہ نہیں دیگی۔ بلکہ کھلی مخالفت اور بغاوت پر آمادہ رہے گی۔ ملک ہندوستان کے طول وعرض میں سرکاری آفیسروں اور نمائندوں نے بہت سارے علمائے کرام پر دباؤ ڈالا کہ حکومت کی اس بے ہودہ اسکیم کی تائید کریں؛ لیکن علماء کرام اپنے آپ کو آزمائش میں ڈالتے ہوئے کنارہ کشی اختیار کرتے رہے۔ کئی کتابچے کئی اداروں سے فیملی پلاننگ کے خلاف شائع ہو چکے تھے۔ حضرت والد صاحب اور آپ کے رفیق خاص مولانا محمد یار نے اس اسکیم کی سخت مخالفت ہی نہیں کی بلکہ کئی جلسوں میں علی الاعلان حکومت کو مخاطب کر کے کہا کہ ''جیسے فرعون نے نجومیوں سے یہ سن کر کہ موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے بعد اس کی حکومت پر زوال آجائے گا۔ موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کو روکنے کے لئے ہزاروں لاکھوں بچوں کو قتل کر ڈالا۔ اسی طرح اندرا گاندھی کی حکومت اپنی فرعونیت پر اتر آئی ہے اور اپنی حکومت کو بچانے کے لئے لاکھوں انسانوں کی نس بندی

کرا کر گویا بچوں کا قتل کروا رہی ہے۔لیکن موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اور فرعون غرق ہوا۔اسی طرح اس حکومت کا بیڑا بھی انشاءاللہ غرق ہو جائے گا‘‘۔والد صاحبؒ بھی پولیس کی نظر میں آ گئے۔مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کسی ناخوشگوار واقعہ ہونے سے آپ کو محفوظ رکھا۔

تعزیہ داری اور لہو ولعب:

جس وقت والد صاحبؒ قصبہ ڈروا میں تشریف لائے تھے،اس وقت پورے گیارہ گاؤں میں تعزیہ داری بڑی دھوم دھام سے عقیدتاً اور عملاً منائی جاتی تھی۔گھر گھر کھچڑا اور مالیدہ پکایا جاتا تھا اور تعزیے پر چڑھایا جاتا تھا۔تعزیہ رات میں ایک ایک گھر کے دروازے کے سامنے رکھا جاتا اور عورتیں گھروں سے نکل کر تعزیے پر چڑھاوا چڑھاتیں۔ منتیں مانتیں اور تعزیے کا چکر لگاتیں۔مرد بڑے شوق سے ڈھول تاشے پیٹتے رہتے۔والد صاحبؒ نے اس رسم کی پرزور مخالفت کی۔قرآن وحدیث سے دلائل دیئے۔گاہے بگاہے علماء کرام کی تقریریں کرائیں اور اس مشرکانہ عمل پر اپنی شدید ناراضگی کا اظہار کیا۔جتنا والد صاحبؒ کی طرف سے روافض کی اس رسم کو چھوڑنے کا دباو عوام پر ڈالا جاتا،اتنا ہی عوام اس رسم کو اختیار کرنے کی دعوت دیتی۔لیکن عقیدۂ توحید کے سامنے عقائد باطلہ کہاں ٹھہر سکتے ہیں؟ رفتہ رفتہ کئی سالوں کی محنت نے رنگ لانا شروع کر دیا اور عوام کو اس رسم سے نفرت ہونا شروع ہو گئی۔

اولاً اکثر گھروں میں محرم کے کھانے پکنے بند ہو گئے۔اس کے بعد امام حسینؓ کا چبوترہ بنانا لوگوں نے بند کیا۔گھر گھر میلاد خوانی اور قرآن خوانی کی رسم میں کمی آنا شروع ہو گئی اور کچھ لوگوں نے تائب ہو کر تعزیہ رکھنا اور خریدنا بند کر دیا۔کمی پر کمی ہوتی چلی گئی۔آج اللہ کا شکر ہے کہ چند لوگوں کے علاوہ اس علاقے میں اس رسم پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔عاشورہ محرم آتا ہے،لوگ روزہ رکھتے ہیں اور اللہ سے اپنی مغفرت چاہتے ہیں۔اللہ قبول فرمائے۔آمین۔(تذکرہ علماء پرتاپ گڑھ)

مولانا محمد سعید نصیر آبادی:

حضرت مولانا سید محمد امین نصیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد حضرت کے مشن اصلاح وتربیت اور دعوت وتبلیغ کے عملاً وارث مولانا محمد سعید صاحب نصیر آبادی ہوئے۔ وہ سید صاحب کے پڑوسی تھے، ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت یقیناً سید صاحب کے ہاتھوں ہوئی ہوگی ، گوکہ انتہائی تعلیم انھوں نے دارالعلوم دیوبند میں حاصل کی تھی، اور شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کے مخصوص تلامذہ میں تھے۔ سید صاحب کے بعد وہی سید صاحب کے مدرسہ کے ذمہ دار مقرر ہوئے اور سید صاحب کے حلقہ ارادت میں تا بہ مقدور کام کو جاری وساری رکھا، اس سلسلے میں آپ پرتاپ گڑھ بھی آیا کرتے تھے، بہ چند وجوہ کام کو زیادہ وسعت دینے کا موقع نہ مل سکا، تاہم انھوں نے پرتاپ گڑھ کے ایک ایسے طالب علم کی پرورش کردی، جس نے سید صاحب کے نظام کو آگے بڑھایا۔

حضرت مولانا سعید صاحب قصبہ نصیر آباد کے معزز خاندان کے ایک فرد تھے؛ بڑے ہی جید عالم اور ذی استعداد فاضل تھے۔ آپ کی خدمات اور کارناموں سے قصبہ نصیر آباد کا چپہ چپہ واقف ہے۔ ان کے والد کا نام عبد الحفیظ تھا۔ مولانا کی ولادت ۱۹۰۸ء میں ہوئی؛ جائے ولادت قصبہ نصیر آباد رائے بریلی ہے۔ ابتدائی تعلیم قصبہ ہی میں حاصل کی؛ پھر مزید حصول علم کی غرض سے بلد اللہ الحرام مکہ مکرمہ کو عازم سفر ہوئے اور مدرسہ صولتیہ میں داخل ہوکر اپنی علمی پیاس بجھانے لگے۔ قرائت سبعہ اور دیگر علوم آپ نے وہیں حاصل کئے۔ سیّد امین نصیر آبادی کے انتقال کے بعد حضرت کی اہلیہ محترمہ حج کو گئیں؛ وہاں مولانا سے ان کی ملاقات ہوئی تو سیدانی صاحبہ نے کہا کہ آپ یہاں پڑے ہوئے ہیں اور سیّد امین صاحبؒ کے انتقال کے بعد پورا علاقہ علماء سے خالی ہوگیا ہے۔ شیعوں نے ہر طرف فساد کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ چنانچہ آپ نے فوراً ہندوستان واپسی کا فیصلہ کیا اور وطن واپس آگئے۔ مولانا نے ہندوستان آکر سب سے پہلے جو کام کیا، وہ اپنی بقیہ تعلیم کی تکمیل تھی؛ آپ دیوبند تشریف لے گئے؛ دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور سند فضیلت حاصل کی۔ دارالعلوم دیوبند کے زمانہ طالب علمی میں مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی بھی شیخ

الاسلام مولانا حسین احمد مدنی سے خصوصی استفادہ کی غرض سے دیوبند میں مقیم تھے، یہ دونوں ہم وطن تھے، اس لئے کھانا وغیرہ ساتھ ہی کھایا کرتے تھے.

وطن واپس آئے تو دیکھا کہ علاقہ کا عجیب حال ہو چکا ہے؛ شیعی استبداد نے سنیوں کو عجیب کسمپرسی کی حالت میں مبتلا کر رکھا ہے؛ سنیوں کی زمین وجائداد ہر چیز پر ان کا جابرانہ تسلط ہے؛ ان لوگوں کے نزدیک سنیوں کی حیثیت غلام اور باندی جیسی تھی؛ جس کی وجہ سے نہ ان کی عزتیں محفوظ تھیں اور نہ عورتیں؛ جس کسی عورت کو وہ خوبصورت دیکھتے اس کو داشتہ بنا لینے میں باک محسوس نہ کرتے۔ حضرت مولانا سعید صاحب انتہائی غیور، جری اور باہمت شخص تھے؛ رب ذوالجلال نے ان کو جاہ وحشمت کے علاوہ رعب ودبدبہ کی نعمتوں سے بھی وافر مقدار میں حصہ عطا کیا تھا۔ آپ کو شیعی اقتدار پھوٹی آنکھ نہ بھایا اور مردانہ وار ان کے مقابلہ میں اتر آئے۔ چنانچہ آپ نے نہ صرف ان سے دوبدو مقابلہ کیا بلکہ قانونی جنگ اور مقدمہ بازی بھی کی۔ اللہ تعالی نے آپ کی مدد کی اور وہ دن نصیرآباد میں آیا کہ شیعی اقتدار خاک میں مل گیا۔ یہ قربانی آپ نے ایسے وقت میں دی، جس وقت علاقہ کے بڑے خانوادے نصیرآباد سے ہجرت کر جانے میں اپنے لئے عافیت محسوس کر رہے تھے۔

صاحب زادے حسن میاں کا بیان ہے کہ حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ نے حالات کی سنگینی کے پیش نظر مولانا کو مشورہ دیا تھا کہ آپ لکھنؤ منتقل ہو جائیں، آپ کی جان کو خطرہ ہے۔ مگر مولانا نے نصیرآباد میں رہ کر مقابلہ کیا اور ہر طرح کی قربانی دی۔ آپ پر بذات خود ۵۲/ باون مقدمات تھے؛ ہفتہ کے اکثر دن مقدموں کی پیروی کے نذر ہو جاتے؛ اندھیرے منہ آپ شہر رائے بریلی کیلئے روانہ ہوتے؛ وہاں پہنچ کر ان لوگوں کے کھانے اور پینے کا بھی انتظام کرتے جو قصبہ والوں میں سنی گروپ کی طرف سے آتے؛ یہ لوگ بیس یا پچیس کی تعداد میں ہوتے اور شام کو واپس آکر ان لوگوں کی غربت کے پیش نظر ان کو پانچ پانچ روپئے بھی دیتے۔ اس طرح آپ نے اس زمانہ میں اپنی جیب خاص سے مقدمات اور دیگر لڑائیوں میں تقریباً اسّی یا نوّے ہزار روپئے خرچ کئے۔ مزاجاً آپ بہت سخت تھے؛ رعب وداب اس پر مستزاد؛ مولانا محمد یار صاحب آپ کے ممتاز شاگرد تھے، وہ

تمام مراحل میں اپنے استاذ کے دست راست ہوا کرتے۔عظمت صحابہ کے جلسے جلوس ہوں یاشیعوں کے خلاف محاذ آرائی، مدرسہ کی ذمہ داری ہو یا مساجد میں امامت وخطابت، ہرجگہ آپ ان کے نائب ہوا کرتے۔ان کو مولانا پر اس قدر اعتماد تھا کہ ایک مرتبہ اپنی پوری جائداد کا وصیت نامہ ان کے نام لکھوا دیا، مگر مولانا نے اس کو منظور نہیں کیا اور وصیت نامہ صاحبزادوں کے حوالہ کردیا۔

مولانا محمد سعید صاحب کا انتقال ۱۹۷۱ء میں ہوا اور قصبہ ہی میں تدفین عمل میں آئی۔(خدا آپ پر رحمتیں نازل فرمائے)

مولانا محمد یار پرتاپ گڑھی:

مصلح ملت حضرت مولانا محمد یار صاحب رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ العزیز کے چہیتے شاگرد، مجاز توبہ، اور بیک واسطہ خلیفہ تھے۔انھوں نے زمانۂ طالب میں ہی اپنے استاذ شیخ الاسلام سے ظاہری علوم کے ساتھ باطنی علوم میں کسب فیض شروع کردیا تھا۔ایک مرتبہ آپ نے شیخ الاسلام سے مولانا سید امین نصیر آبادیؒ کے قائم کردہ اصلاحی طریقہ کار اور فسق وفجور میں مبتلا اشخاص سے توبہ وغیرہ لینے کے بارے میں تذکرہ کیا اور یہ بھی بتلایا کہ لوگ اب مجھ سے توبہ وغیرہ کرانے کے لئے کہتے ہیں، اس سلسلے میں کیا کیا جائے؟ حضرت مدنیؒ نے اس طریقہ کی تحسین فرمائی، اور فرمایا: ”میں تمھیں توبہ کرانے کی اجازت دیتا ہوں“۔مولانا کو اپنے شیخ سے وارفتگی کی حد تک محبت تھی، ان پر شیخ الاسلام کے مجاہدانہ کردار، جرأت مندانہ اقدام، استقامت، اتباع سنت اور درویشانہ زندگی کے گہرے نقوش تھے، آپ کی زندگی کے ہر پہلو میں شیخ الاسلام کا عکس نمایاں طور پر نظر آتا تھا۔

مولانا نسیم اللہ مظاہری نے خوب ترجمانی کی ہے:

گزاری سنت نبوی میں جس نے زندگی اپنی
سنواری ہے خلوص دل سے جس نے بندگی اپنی
ملا تھا وصف یہ ان کو جناب شیخ مدنی سے
خلافت اور شاگردی ملی تھی شیخ مدنی سے

وہ اپنے شیخ کی توصیف میں بے تاب رہتے تھے
کلام مرشد کامل میں وہ غرق آب رہتے تھے
جب ان کا تذکرہ آتا مچل جاتا تھا دل ان کا
پھرایا چارسو پرچم جناب شیخ کامل کا

مولانا محمد یار صاحب کے والد ملا محمد عمر صاحب، حضرت مولانا سید محمد امین نصیر آبادی کے متوسلین میں تھے۔ حضرت سید صاحب کے آخری زمانہ میں وہ اپنے لخت جگر کو لیکر سید صاحب کی خدمت میں دعاء کی غرض سے حاضر ہوئے۔ تو حضرت نے نہ صرف دعاؤں سے نوازا، بلکہ فرمایا کہ جب یہ (مولانا محمد یار) بڑے ہو جائیں تو ان کو میرے یہاں پڑھنے کے لئے بھیجنا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، مگر سید صاحب کے انتقال کے بعد سید صاحب کے عملی جانشین اور ان کے مدرسہ کے ذمہ دار مولانا محمد سعید صاحب نصیر آبادی کے ہاتھوں اس ارشاد کی تکمیل ہوئی، چنانچہ وہ بچپن میں ہی آپ کو نصیر آباد لے کر چلے گئے تھے، جہاں قرب زمانی کی وجہ سے صبح وشام سید صاحب کے تذکرے عام تھے۔ پھر یہ قیام بھی محض زمانہ طالب علمی تک محدود نہ تھا، بلکہ ایک زمانہ تک مدرس، مبلغ، عالم، مفتی اور امام وخطیب کی حیثیت سے بھی انہیں سید صاحب کے وطن اور حلقۂ ارادت میں کام کرنے کا موقع ملا۔ سید صاحب کے ذکر خیر سے معمور جس زمزمہ میں انھوں نے آنکھیں کھولیں تھی، وہ اس پر مستزاد۔ ان اسباب وعوامل کی وجہ سے مولانا محمد یار صاحب کے لئے سید صاحب کی ذات روحانی جد امجد جیسی ہو گئی تھی، ان کے طرز اصلاح اور طریقہ تربیت، امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے مولانا کو خاص لگاؤ تھا۔ ڈاکٹر تابش مہدی صاحب لکھتے ہیں:

''مولانا محمد یار علماء وصلحاء کی اس جماعت سے تعلق رکھتے تھے، جس نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر، اصلاح معاشرہ اور زندگی کے تمام گوشوں میں ملت کی رہنمائی کو نہ صرف اپنا فریضہ تصور کیا، بلکہ اپنے عمل اور شب وروز کی جد وجہد سے اس کا ثبوت بھی فراہم کیا........ چونکہ وہ مجدد عصر حضرت مولانا سید محمد امین نصیر آبادی کے مدرسہ کے فیض یافتہ تھے، ان کے والد محترم محمد عمر قریشی حضرت سید نصیر آبادی کے متوسلین میں تھے اور قرب

زمانی کی وجہ سے شب وروز سید نصیر آبادی کے روحانی کمالات اور ان کی اصلاحی وتبلیغی خوبیوں کا تذکرہ سنتے رہے تھے،اس لئے ان کی زندگی پر سید نصیر آبادی کے طرز اصلاح اورمجاہدانہ سعی و جہد، عالمانہ جرأت و بے باکی اور مومنانہ فہم وتدبر کا بڑا اثر تھا۔انھوں نے اپنی اس ذمہ داری سے کبھی غفلت نہیں برتی، جو ایک عالم کی حیثیت سے ان پر یا کسی بھی عالم دین پر آتی ہے۔انھوں نے اصلاحی وتبلیغی مقصد سے وہاں کے علماء اور دوسرے ارباب دین کی شراکت میں ''اصلاح المسلمین'' کے نام سے ایک تنظیم قائم کی تھی ، گاؤں گاؤں اس کے جلسے ہوتے تھے،اس کے تحت شرعی پنچایتیں قائم تھیں،جس نے پورے ضلع میں ایک عجیب قسم کی اسلامی وروحانی فضا استوار کردی تھی ۔(مہک چھوڑ گئے ۔از تابش مہدی)

قسام ازل نے مولانا کو ایک ایسا دل دیا تھا،جو خدمت اسلام اور ہمدردی قوم سے معمور تھا۔اصلاح خلق اور تہذیب معاشرہ کی راہ میں تکالیف اور آزار برداشت کرنے میں وہ اس بلند پہاڑ کی مانند تھے،جس کو نہ زلزلہ ہلا سکتا اور نہ بجلی گرا سکتی تھی۔لیکن گھر کی خستہ حالی،معاش کی تنگی ہر طرح سے میدان عمل میں قدم رکھنے سے مانع تھی۔تاہم ذات باری پر توکل کامل نے ان کے پائے عزم واستقلال میں لغزش نہیں آنے دی۔انھوں نے ان تمام خیالات اور وساوس پر لاحول پڑھی، اللہ کا نام لیا اور اپنے روحانی جد امجد حضرت مولانا سید محمد امین نصیر آبادیؒ کے طریقہ اصلاح کو زندہ کرنے اور اس کو تازگی بخشنے کا حوصلہ اور جذبہ لیکر مردانہ وار میدان عمل میں کود پڑے۔ مشکلات کا سامنا ہوا،مصائب سے واسطہ پڑا،سخت اور تند آندھیوں کا مقابلہ ہوا۔اپنوں کے طعنے،غیروں کے چرکے سہنے پڑے، رشتہ داروں نے دامن چھڑائے اور ناتے داروں نے منھ موڑے ۔مگر کسی کی فکر کئے بغیر آپ کوہ وقار واستقامت بنے کھڑے رہے،نہ آپ کے پاؤں میں لغزش آئی، نہ آپ کی استقامت وثابت قدمی میں جنبش۔اس بابت نہ آپ کو اپنے اعزہ کی فکر ہوئی نہ اقارب کی،نہ مال کا لالچ نہ دولت کی حرص۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے
کہ بندہ زمانہ سے خفا میرے لئے ہے

حضرت مولانا قمر الزماں صاحب الہ بادی لکھتے ہیں:

"آپ (مولانا محمد یار صاحب) کے اندر دعوت وتبلیغ کا زبردست جذبہ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا بہت داعیہ تھا۔اس لئے رسوم وبدعات کی بیخ کنی کے لئے "جمعیۃ اصلاح المسلمین" قائم فرمائی، جس کے تحت گاؤں گاؤں سائیکل سے اور کبھی پیدل جا کر وعظ فرماتے اور رسوم وبدعات سے لوگوں کو منع کرتے۔(اقوال سلف)

آپ کے احباب:

حدیث پاک ہے "**کل میسر لما خلق له**" یعنی اللہ رب العالمین جو کام جس بندے سے لینا چاہتے ہیں، اس کے لئے وہ کام آسان کر دیتے ہیں۔رب ذوالجلال نے مولانا کے لئے اس کام کو اس طرح بھی آسان کر دیا تھا کہ آپ کو ایسے اصحاب واحباب عطا فرمائے، جنھوں نے تمام کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور مددگار ثابت ہوئے۔یہ لوگ اپنے سینوں میں امت کے لئے ایک دھڑکتا ہوا دل رکھتے تھے۔ یہ صاف دل، انصاف پسند، زبان کے کھرے اور ارادہ کے پختہ لوگ تھے، جنھوں نے نہ صرف مسلمانوں میں نئی روح پھونکی، بلکہ موجودہ دور میں مسلمانان پرتاپ گڈھ واطراف میں تنظیمی وتعلیمی ترقی انہی حضرات کی مرہون منت ہے، علاقہ میں کوئی ایسا نہی ہے جو ان حضرات کے بار احسان سے گردن اٹھا سکے۔

پرتاپ گڈھ کی کسی اسلامی تاریخ میں اگر مولانا اور ان کے ان مخلص دوستوں، باہمت وجری ساتھیوں کا تذکرہ نہ ہو تو وہ تاریخ ناقص ونامکمل رہے گی۔علماء ومشائخ میں حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ، حضرت مولانا منیر احمد صاحبؒ یغمانی، حضرت مولانا عبدالقدوس صاحب، دیگر قائدین میں منشی ابراہیم صاحب ٹکریؒ، ملا مصلح الدین صاحب سرائے بابو، ماسٹر دلمیر صاحب ڈھکوا، وکیل اسرار صاحب، منشی رحم علی صاحب جھوارا اور حاجی رمضان علی صاحب ایڈوکیٹ وغیرہ ایسے یادگار زمانہ لوگ تھے، جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک انجمن تھا۔یہ تمام اکابر وقائدین جب مولانا محمد یار صاحب کی معیت میں ایک پلیٹ فارم پر آئے تو ایک انقلاب آ گیا، اس وقت علاقہ میں جو بھی تعلیم وتربیت اور اصلاح وتبلیغ کے

تعلق سے کام ہوا، اس میں مولانا محمد یار صاحبؒ اور ان کے یہ احبابؒ براہ راست یا بالواسطہ ضرور کارفرما رہے۔ چنانچہ آپ کی آواز علاقہ در علاقہ گونجی، گاؤں در گاؤں پہونچی، شہر والوں نے بھی سنی اور دیہاتیوں نے بھی؛ پڑھے لکھے لوگوں نے بھی سنی اور ان پڑھوں نے بھی، کھیتی باڑی کرنے کسانوں نے بھی سنی اور تجارت کرنے والے دکان داروں نے بھی: ۔

جہاں بانی سے ہے دشوار تر کار جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

تحریک اصلاح المسلمین:

اصلاحی تحریک ''اصلاح المسلمین'' کا اجلاس عام غالباً: ۱۹۶۰ء، میں ''گاؤں سرائے بابو'' میں الحاج ملا مصلح الدین صاحب کے یہاں ہوا، اجلاس کے میزبان ملاجی موصوف خود تھے، اس اجلاس میں پرتاپ گڈھ کے تمام اہل حل وعقد شریک ہوئے، ان میں خاص طور پر قابل ذکر شخصیات یہ ہیں: حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحبؒ پھول پوری، حضرت مولانا منیر احمد صاحبؒ یغمانی، حضرت مولانا عبدالقدوس صاحبؒ، حضرت مولانا حسن مجتبیٰ صاحبؒ بیگم وارڈ، حضرت مولانا کفایت اللہ صاحبؒ دھرم پور، مولانا لئیق صاحبؒ الہ آبادی، مولانا ریحان صاحب سلطان پوریؒ، مولانا معصوم صاحبؒ، مولانا سلیم کالے خان صاحب کھرک پور اور مولوی بشیر صاحبؒ کنڈہ۔

اجلاس میں دینی بیداری اور اسلامی احیاء کے لئے قوم میں جدوجہد کرنے اور اس کے لئے ہر طرح کی قربانی دینے کے حوالہ سے بات چیت ہوئی اور اس کے لئے اس بات کو ضروری قرار دیا گیا کہ ہم سب کا ایک امیر ہو، جس کی سرکردگی اور سربراہی میں یہ کام انجام پائے۔ اس اجلاس میں متفقہ طور پر بحیثیت امیر، قاضی وقائد مولانا محمد یار صاحبؒ کا انتخاب عمل میں آیا۔ تابش مہدی صاحب لکھتے ہیں:

”عارف باللہ حضرت مولانا شاہ محمد یار صاحب پرتاپ گڑھی اس (قضاء کی ذمہ داری کے) منصب پر فائض تھے اور پورے خطے میں ایک مصلح ورہنما کے طور پر جانے جاتے تھے۔“ (علم الاحکام: ۱/ ۴)

طریقۂ کار:

مولانا مرحومؒ اور آپ کے دوستوں نے وسط شہر پلٹن بازار کی جامع مسجد کو اپنی تحریک کا مرکز بنایا، جہاں اس وقت وکلاء اور دانشوران قوم کی ایک بڑی تعداد رہتی تھی۔ اسی مسجد میں مشورے ہوتے اور یہیں لائحہ عمل طے کئے جاتے، پروگراموں ومیٹنگوں کی بابت فیصلے ہوتے اور یہیں سے مولانا محمد یار صاحب اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پورے ضلع پرتاپ گڑھ واطراف کا دورہ کرتے۔ آپ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سائیکل سے گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ جاتے۔ یہ حضرات کھاپینا اپنے گھر سے لے کر جاتے۔ ضرورت کی تمام چیزیں اس قافلہ کے ہمراہ ہوتیں، حتی کہ سائیکل میں ہوا بھرنے والی پمپ بھی۔ علاقہ میں جاکر وہاں کے لوگوں سے ملتے اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیغام پہونچاتے، غیر اسلامی اور غیر شرعی چیزوں سے منع کرتے۔

ان حضرات نے اس طرح نہ صرف یہ کہ غلط رسمیں ختم کیں بلکہ بوڑھوں سے ہندوانہ لباس اتروائے، ختنہ کی بے جا رسموں پر روک لگوائی، عورتوں کو نقاب پہنوایا، ان کا میلہ، ٹھیلہ میں جانا موقوف کرایا، مرنے کے بعد کا فقیرانہ ختم کرایا، بچوں کو مکاتب ومدارس بھجوایا اور نوجوانوں کو نمازی ودیندار بنایا۔

شروع میں مولانا مرحوم تن تنہا شادی، بیاہ کی دعوتوں میں جاتے، تو وہاں موجود لوگوں کو جمع کرتے اور کھڑے ہوکر تمام خلاف شرع امور پر بصیرت افروز تقریر کرتے اور قوم کی غیرت کو جگاتے، مجمع محو سکوت ہوتا، لوگ نادم ہوتے اور غلط کاموں سے توبہ کرتے، اگر میزبان غلط امور کو فی الفور موقوف نہ کرتا تو آپ بلا کھائے پیئے، گھر واپس لوٹ آتے۔ چنانچہ بابوگنج کے زمانۂ تدریس میں وہاں کے ایک اہم آدمی کے گھر شادی پڑی، آپ نے شرکت کے لئے شرط لگائی کہ عورتوں کو مرد کھانا نہیں کھلائیں گے، انھوں نے انحراف

کیا تو آپ نے شرکت نہیں کی اور بعد کو اسی وجہ سے مدرسہ کو خیر باد کہنا پڑا۔

بیشتر گاؤں میں آپ نے کچھ لوگوں کو ذمہ دار بنا دیا تھا۔ جو گاؤں کے لوگوں کی دینی بیداری اور سماجی اصلاح کے لئے جدوجہد کرتے اور وہاں کے معاملات پر نظر رکھتے۔ گاؤں کا کوئی فرد اگر کسی غیر اسلامی حرکت کا مرتکب ہوتا، یا کسی حکم شرع کی صریح خلاف ورزی کرتا، تو وہ لوگ اس بات کا سختی سے نوٹس لیتے اور اس کو اس عمل سے باز رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے۔ اگر جرم بڑا ہوتا تو وہ لوگ اس کو ٹاٹ باہر کرتے اور اس کا حقہ پانی بند کر دیتے۔ چنانچہ اس مجرم کو اب نہ کوئی شادی بیاہ میں بلاتا، نہ دعوت دیتا، نہ کسی تقریب میں اسے شرکت کی اجازت ہوتی۔ اس کا حقہ پانی اور بیاہ شادی سب بند۔ اب اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا کہ وہ مولانا محمد یار صاحبؒ کے پاس اوگئی پور آئے اور اپنے معاملات کو سامنے رکھے۔ وہ شخص آتا، تو مولاناؒ متعلقہ گاؤں اور اس کے آس پڑوس گاؤں کے ذمہ داروں کو جمع کرتے۔ قریبی علاقہ کا معاملہ ہوتا تو اوگئی پور میں مولانا کے گھر ہی لوگ آجاتے۔ دور ہونے کی صورت میں حضرت والا خود اپنے احباب کے ہمراہ اس گاؤں میں تشریف لے جاتے۔ اور صورت حال پر تبادلۂ خیال کرتے۔ اگر واقعتا وہ شخص مجرم ہوتا تو اس پر مواخذہ ہوتا۔ بھری مجلس میں اس سے توبہ لی جاتی، اور آئندہ ایسی حرکتوں سے باز رہنے کا پختہ عہد لیا جاتا۔ یہ سب ہونے کے بعد ہی اس شخص کو دوبارہ برادری میں شامل کیا جاتا۔

مواخذہ مجرم کے حسب حال ہوا کرتا تھا۔ اگر وہ شخص غریب ہوتا تو اس پر یہ بات لازم کی جاتی کہ وہ اتنے دنوں (متعینہ دن مثلاً ایک مہینہ یا دو مہینے) تک فلاں فلاں مساجد میں جمعہ کے دن نمازیوں کے لئے پانی بھرے، اور اگر وہ شخص مالدار ہوتا تو اس پر مالی تاوان لازم کیا جاتا، یا اسی طرز کا کوئی اور پر مشقت کام تادیباً لاگو کیا جاتا، کہ آئندہ وہ اس قسم کی حرکتوں سے باز رہے۔ گویا ایک طرح کی اسلامی عدالت قائم کر دی گئی تھی، جو قرآن وحدیث کی روشنی میں فیصلے کرتی، اور لوگ بسر و چشم قبول کرتے، اگر نہ کرتے تو قوم مجبور کر دیتی اور نا چاہتے ہوئے بھی اسے قبول کرنا پڑتا۔ مولانا نسیم اللہ مظاہری نے اسی حوالہ

سے کہا:

خلاف سنت نبوی اگر کرتا کوئی حرکت
تو ایسے بے ادب گستاخ کی آ جاتی تھی شامت
رواج ورسم وبدعت سے ہمیشہ ان کو نفرت تھی
جو بدعت کے تھے شیدائی، انہیں ان سے عداوت تھی
جو پھیلاتے تھے بدعت، ان سے کرتے تھے جہاد اکثر
مقابل میں کھڑے ہو جاتے تھے سر ہاتھ میں رکھ کر
علاقہ میں جہاں پھیلی ہوئی تھی رسم وگمراہی
خلوص دل سے جاکر ان کو سیدھی راہ دکھلائی
مسلسل جاکے ان خطوں کا دورہ کرتے رہتے تھے
نبی کا راستہ پکڑیں، یہی تلقین کرتے تھے
حریفانہ ہوس والوں کا ہر دم ان پہ پہرا تھا
کہ ان کا بے گنہ ہونا ہی ان کا جرم ٹھہرا تھا

بارات اور جہیز کے خلاف تحریک:

غیر مسلموں کے بیچ رہنے کی وجہ سے مسلم سماج میں بارات اور نمائشی جہیز کی عنوان سے جو لعنت در آئی، وہ دیمک کی طرح انہیں تباہ وبرباد کر رہی ہے۔ پرتاپ گڈھ میں بھی یہ لعنت اپنی تمام تر خرابیوں کے ساتھ پائی جاتی تھی۔ چنانچہ بارات رات میں جاتی اور پوری رات لڑکی والوں کے گھر پر قیام کرتی، صبح واپس آتی۔ یہ طریقہ ہندوانہ تھا، جو سراسر غیر اسلامی اور غیر شرعی تھا۔ اس کے نتیجہ میں لڑکی والوں پر بے جا بوجھ پڑتا اور فواحش ومنکرات کے نت نئے دروازے کھلتے۔ اس کے سد باب کے لئے مولانا مرحوم اور آپ کے باہمت ساتھی کھڑے ہوئے اور اس کے خلاف ایک تحریک چھیڑ دی۔ گاؤں ''دباہی'' کے خان ایوبؒ کے مکان پر اس سلسلے میں ایک اجلاس ۱۹۶۲ء میں طلب کیا گیا۔ جس میں فیصلہ لیا گیا کہ آئندہ بارات دن میں جایا کرے گی۔ چنانچہ اس کے بعد سے رات میں بارات کا

جانا موقوف ہوگیا۔اور دھیرے دھیرے میانہ کی چڑھائی، رات کا سوہر(گانا)، دولہے کی منھ دکھائی، وغیرہ بھی ختم ہوئی۔

اس کے بعد اصل مقصد کے لئے پھر ایک اجلاس اوگئی پور میں طلب کیا اور اس میں یہ فیصلہ لیا کہ مسلمان بارات لیجانا ختم کردیں، اور لڑکی کے والدین پر بے جا بوجھ ڈالنے سے پرہیز کریں، ہاں اگر لڑکی والوں کی طرف سے بارات کا مطالبہ ہوتو صرف اپنے اہل وعیال کے ساتھ جائیں، دوسروں کے دسترخوان پر اپنی طرف سے دعوت دے کر لوگوں کو ہرگز نہ لے جائیں، یہ طریقہ شرعاً اور اخلاقاً ہر طرح سے غلط ہے۔لڑکے والے جہیز لینے سے پرہیز کریں، اگر لڑکی والے اپنی بچی کو کچھ دینا ہی چاہتے ہیں، تو اسے بعد میں دیں یا چھپا کر دیں، تاکہ غریب گھر کی بچیوں کے لئے مسائل پیدا نہ ہوں۔الحمدللہ ان باتوں پر اسی وقت سے مسلمانوں نے عمل شروع کردیا۔مفتی عزیزالرحمان صاحب فتح پوری مفتی اعظم مہاراشٹرا لکھتے ہیں:

’’مولانا محمد یار صاحب پرتاپ گڑھیؒ کی ذات گرامی پرتاپ گڑھ واطراف کے علاقوں کے لئے روشنی کا مینارہ تھی، خاموش طبع مصلح ورہنما تھے، اور ان کی یہی خدمات ہیں، جن کی بنا پر علاقے کے تمام لوگ آج بھی بڑے احترام وعقیدت سے ان کا نام لیتے ہیں‘‘۔(علم الاحکام:۱؍۴)

دارالقضاء کا قیام:

مولانا محمد یار صاحب اپنے تئیں مسلمانوں کے معاملات کو قرآن وحدیث کی روشنی میں حل کیا کرتے تھے، مگر باقاعدہ اس کے لئے کوئی دفتر اور دیوان نہ تھا کہ جس میں بیٹھ کر مکمل عدالتی کاروائی کی جاتی اور بحث وتمحیص کے بعد فیصلہ صادر ہوتا، اور لکھے ہوئے نئے پرانے ریکارڈ محفوظ ہوتے۔ جب کہ فیصلوں اور قضایا میں ان چیزوں کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔اس کام کے لئے لوگ عدالت اور کچہری کا رخ کیا کرتے تھے، جہاں انصاف تو کیا ملے، وہاں جانا مستقلا ایک مصیبت ہے۔وہاں کے فیصلے ایک طویل زمانے کے بعد بھی نہیں آتے اور بعض دفعہ فیصلہ اس وقت صادر ہوتا ہے جب کہ مدعی ومدعی علیہ دونوں

یاان میں سے کوئی ایک دنیا سے رخصت ہو چکا ہوتا ہے۔شرعی عدالتوں کی اس وقت ضرورت اور بڑھ جاتی ہے جب معاملہ مسلمانوں کے عائلی اور پرسنل زندگی سے متعلق ہو یعنی نکاح، بیاہ، طلاق، خلع اور رجعت وغیرہ کا۔چونکہ اگر ایسے معاملات مسلمان عدالت میں لے کر جائیں اور مقدمہ درمقدمہ کی نوبت آجائے تو معاملہ ہی خراب ہوجاتا ہے اور مقصد کبھی حاصل نہیں ہوتا۔ان امور نے مولانا مرحوم کو دارالقضاء اور شرعی عدالت کھولنے کے لئے مجبور کردیا۔چنانچہ ۱۹۸۶ء میں آپ نے ''اوگئی پور'' اپنے گاؤں میں ایک نمائندہ اجلاس طلب کیا اور دارالقضاء کھولنے کی تجویز پیش کی۔تمام لوگوں نے آپ کی اس تجویز پر بیک زبان لبیک کہا اور اپنے معاملات دارالقضاء اور شرعی پنچایت میں حل کرانے کا عہد کیا۔یہ دارالقضاء تب سے آج تک برابر مسلمانوں کے معاملات کو لیتا ہے اور قرآن وحدیث کے مطابق فیصلے کرتا ہے۔اس کی دیکھ ریکھ مولانا مرحومؒ کے بعد، ان کے بڑے فرزند مولانا قاضی محمد امین صاحب قاسمی کرتے ہیں، جوامارت شرعیہ پٹنہ کے روح رواں حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام صاحبؒ سابق صدر مسلم پرسنل لاءبورڈ کے تربیت یافتہ ہیں۔

چندواقعات:

حدیث پاک میں ظالم وجابر حکمرانوں کے روبرو حق بات کہہ دینے کوسب سے افضل جہاد کہا گیا ہے۔وجہ اس کی یہ ہے کہ حق و انصاف کی بات یوں تو کہہ دینا بہت آسان ہے،لیکن معاملہ جب کسی صاحب حیثیت وذی جاہ کا ہو،اس کے خلاف حق بات کہنے سے عموماًزبانیں گنگ رہ جاتی ہیں،ایسے وقت حق وانصاف کی بات سرعام کہہ دینا،مشکل کام ہے۔مولانا محمد یار صاحب اس معاملہ میں انتہائی جری واقع ہوئے تھے۔ڈاکٹر تابش مہدی صاحب لکھتے ہیں:

''مولانا محمد یار صاحب حق گوئی وبیباکی کے پیکر تھے،انھوں نے کبھی حق وناحق کے معاملے میں اپنے پرائے کا خیال نہیں کیا،جو بات جب اور جس موقعہ پرحق اوردرست سمجھی،اس کا کھل کر اظہار کیا اور جس بات کو نادرست یا ناروا سمجھا،اسے سرعام مسترد کردیا۔یہ ان کی ایسی ادا تھی،جس کے لئے وہ پورے مضافات میں مشہور تھے۔آج بھی ان کی

جرأت و بے باکی، حق گوئی وراست بازی اور دینی حمیت کے سینکڑوں واقعات، وہاں کے لوگوں کے حافظے میں محفوظ ہیں (مہک چھوڑ گئے، از تابش)

حق گوئی کی پاداش میں مولانا کو بارہا مصائب وآلام کا سامنا ہوا، اور سخت سے سخت چیلنجوں کا سامنا ہوا، حق گوئی کی پاداش میں ایک مرتبہ بعض قدآور شخصیات کی طرف سے حیلے، بہانے کر کے مولانا کو سماج سے بالکل الگ تھلگ کر دینے کی بھرپور کوشش کی گئی اور آپ کو سخت حالات کا سامنا ہوا، تاہم آپ نے صبر وضبط کیا، مگر اپنے موقف اور ذمہ داری سے ایک قدم بھی پیچھے ہٹنا گوارہ نہ کیا، کچھ دنوں بعد ان لوگوں کو تنبہ ہوا اور معاملہ صاف کرلیا گیا۔ ایسے مشکل وقت میں جو لوگ آپ کے شانہ بشانہ کھڑے رہے ان میں سے جناب فوجدار صاحب گہری اور ملا محمد ابراہیم صاحب تیج گڑھ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

گاؤں ڈھکوا کے ایک خان صاحب تھے، جو انتہائی جری اور نڈر آدمی تھے، صحت جسمانی اور فارغ البالی کی نعمت سے مالا ل تھے۔ پولیس محکمہ میں خصوصی رسائی کے سبب بے خوف وخطر من چاہی زندگی گزاتے۔ مار دھاڑ ان کا پیشہ اور گالم گلوج انکا شیوہ، نہ ان سے کوئی الجھتا اور نہ ٹکر لیتا، ان سے مخالفت کرنا اپنے ہاتھوں مصیبت موہ لینا تھا۔ سینہ زوری اور سرشوری کے بخار نے انہیں ایک غیر مسلم عورت کو داشتہ بنانے پر آمادہ کر دیا۔

مولانا محمد یار صاحب کو معلوم ہوا تو آپ نے خود جامع مسجد ہنڈور میں ان صاحب کے خلاف بائیکاٹ کا اعلان کر دیا اور کہا کہ اس ظالم کو نہ تو کوئی اپنی شادی بیاہ میں بلائے اور نہ اس کی کسی تقریب میں اس کے یہاں کوئی جائے۔ بائیکاٹ تو آپ نے کر دیا، مگر عادت کو دیکھتے ہوئی ان کی طرف سے انتقامی کارروائی کا سخت اندیشہ تھا۔

ابھی چند ہی روز گذرے ہوں گے کہ آپؒ اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ بذریعہ ''تانگہ'' رام پور بجھا کی طرف سے کسی پروگرام میں شرکت کر کے واپس آ رہے تھے۔ صبح کا وقت تھا اور راستہ بالکل سنسان، اچانک دیکھتے ہیں کہ وہ خان صاحب سامنے سے بذریعہ سائیکل چلے آ رہے ہیں اور جوں ہی قریب پہنچتے ہیں، سائیکل سے اتر کر آپ کی طرف لپکتے

ہیں، آپ نے سمجھا کہ شاید نیت بدتمیزی کی ہے۔ فوراً آپ ''تانگہ'' سے کود پڑے، اتنے میں خان صاحب آگے بڑھے اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا، ایسی صورت حال میں بھی آپ نے مصافحہ سے گریز کیا اور فرمایا: آپ کو شاید معلوم نہیں ہے کہ میں نے آپ کا بائیکاٹ کر دیا ہے؟ میں آپ سے مصافحہ نہیں کر سکتا ہوں۔

مولانا کی ان باتوں کا خان صاحب پر ایسا اثر ہوا کہ کہنے لگے: حضرت! جب سے میں نے یہ خبر سنی ہے کہ آپ نے میرا بائیکاٹ کر دیا ہے، میرا سینہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہا ہے، بھلا قوم میں کوئی ایسا فرد پیدا تو ہوا جس نے میری ناک میں نکیل ڈال دی۔

بعد میں انھوں نے پوری قوم کے سامنے توبہ نصوحہ کی اور تازیانہ ادا کیا۔ اپنی غیر مسلم بیوی کو مسلمان کیا اور خود مولانا کے حکم سے شاہ وصی اللہؒ صاحب الہ آبادی کے ہاتھ بیعت ہوئے۔ ؎

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
جو ہو عزم یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتحِ زمانہ

گاؤں باسوپور میں ایک صاحبؒ کا کسی وجہ سے بائیکاٹ ہو گیا اور لوگوں نے ان سے اپنے تعلقات منقطع کر لئے۔ ان کے گھر شادی پڑی اور لوگوں نے دعوت میں شرکت سے انکار کر دیا، تو بھاگے بھاگے مولاناؒ کے پاس آئے اور اپنا معاملہ رکھا۔ اس وقت مولانا کو کنٹھ مالا کے مرض کا سخت ترین عارضہ تھا، صاحب فراش، اپنی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے، مگر ان کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے، آپ نے ان کے گھر جا کر مسئلہ کے تصفیہ کا وعدہ کر لیا۔ چنانچہ جس دن ان کے گھر شادی کا پروگرام تھا، انھوں نے لوگوں سے کہا کہ میں مولانا کے روبرو توبہ کرنے کے لئے تیار ہوں، آپ برادری کے لوگ میرے گھر آئیں۔

اس غریب نے توبہ تو کر لی البتہ تازیانہ ادا کرنے کی بابت اس خوش گمانی میں مکر گیا کہ اب یہاں سے کون جائے گا، سب لوگ کھانا کھالیں گے اور بائیکاٹ از خود ختم ہو جائے گا۔ مگر مولانا محمد یار صاحب نے کہا کہ اگر یہ صاحب تازیانہ ادا کرنا قبول نہیں کرتے، تو

میری چارپائی اٹھاؤاور مجھے میرے گھر پہنچادو۔آپ کا اشارہ پاتے ہی تمام لوگوں نے ان کی دعوت کوان کے منہ پر ماردیااوراپنے گھروں کی راہیں لیں۔

مچھندرکازہرہ آب ہوا

اسی طرح کا ایک واقعہ ''سرائے مکئ'' کا ہے، وہاں ایک صاحب بدمعاش قسم کے تھے، وہ ایک بڑے جرم میں شریک پائے گئے، جس کی وجہ سے دیگرلوگوں کے ساتھ ان سے بھی توبہ لینی تھی۔انھوں نے کہہ رکھا تھا کہ نہ تو میں جرم کا اعتراف کروں گا اور نہ توبہ کروں گااور اگر مولانا ادھر کو آئے تو میں ان کو ذلیل ورسوا کر کے چھوڑوں گا۔تاہم آپ جب وہاں پہنچے اور سامنا ہوا تو ان صاحب نے نہ صرف بڑے ادب واحترام سے آپ کو اپنے گھر بٹھایا بلکہ علی الاعلان اپنے گناہ سے توبہ بھی کیا۔

ہیبتِ حق کا کرشمہ

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ گاؤں ''سونپور'' کے ایک گھرانے میں توبہ کرانے کیلئے آپ کو جانا تھا، کچھ لوگوں نے آپس میں طے کیا کہ اس مولوی نے ہم لوگوں کو عجیب پریشانی میں مبتلا رکھا ہے۔لاؤ! اسے مار پیٹ کر درست کردیں ''کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری''۔

چنانچہ ان لوگوں نے دو پولیس والوں کو پیسہ دیکر اس بات کے لئے آمادہ کرلیا کہ اس مولوی کو پکڑ کر دو تین سونٹے (ڈنڈے) لگادیں۔ پروگرام کے تحت دونوں پولس والوں کو ''سونپور'' کی نہر پر ''نوبستہ'' کے پاس کھڑا کردیا گیا، جہاں سے واپسی میں مولانا کو گذرنا تھا۔آپ سونپور گئے،لوگوں کو توبہ کرائی اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے کی تلقین کی۔جب واپس آنے لگے تو کیا دیکھتے ہیں کہ راستے کے بیچ وبیچ دو پولیس کے جوان اور مزید چند لوگ کھڑے ہیں۔دیکھ کر دل ہی دل میں گھبرائے کہ نہ جانے ان کی کیا نیت ہے، مگر اللہ کا نام لیکر آگے بڑھتے گئے۔خدا کی شان کہ جوں ہی آپ ان پولیس والوں کے پاس پہونچے، پولیس والے انجانے خوف کے مارے پیچھے ہٹ گئے اور آپ کو گذر جانے دیا۔(بعد میں اس سازش کا پردہ فاش ہوا)

نصرتِ غیبی

اسی طرح کا ایک واقعہ ذکر کرتا ہوں، جس میں اللہ نے غیب سے آپ کی کھلی مدد کی۔ وہ یہ کہ ایک صاحب نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی۔ معاملہ مولانا کے پاس آیا اور فیصلہ ہوا کہ جہیز کا سارا سامان واپس ہوگا اور فوری طور پر اسے مولانا ہی کے گھر رکھ دیا جائے، تا کہ وہیں سے لڑکی کے والدین سامان اپنے گھر لے جائیں۔ لڑکے والوں نے سامان لاکر مولانا کے گھر پہنچا دیا۔ اور وہ احاطہ نما مولانا کے مکان میں رکھ دیا گیا۔ مگران لوگوں کی نیت خراب ہوئی اور آپس میں مشورہ کیا کہ رات میں چل کر سارا سامان مولانا کے گھر سے اٹھا لائیں۔ اس طرح ہمیں سامان واپس مل جائے گا اور جواب دہ مولانا ہوں گے۔ حسب پروگرام وہ لوگ رات میں جمع ہوئے اور ایک ساتھی کو بھیجا کہ جا کر موقع کا جائزہ لے اور اطلاع دے کہ آیا سامان اسی جگہ رکھا ہے یا کسی اور جگہ منتقل کر دیا گیا؟ وہ صاحب آئے اور احاطہ پر چڑھنے کی کوشش شروع کی۔ ابھی وہ چند ہی قدم رکھ پائے ہوں گے کہ ایک اژدہا اُن کی طرف لپکا، یہ صاحب بھاگے، اس نے ان کا پیچھا کیا اور کافی دور تک دوڑا کے چھوڑا۔ پھر ان لوگوں کو ہمت نہ ہوئی کہ سامان اٹھا کر لے جائیں۔ (اس سازش کا بھی علم بعد میں ہوا)

بالآخر مولانا اور ان کے ساتھیوں کی محنت رنگ لائی اور مسلمانان پرتاپ گڈھ کا معاشرتی نظام بہت کچھ صالح اور اسلامی ہوگیا۔ چنانچہ اہل نظر جانتے ہیں کہ آج ضلع پرتاپ گڈھ میں غلط رسوم، بدعات وخرافات اور شادی بیاہ میں اسراف سے جتنا بچا جاتا ہے اور نکاح بیاہ کا عمل جس سادگی سے انجام پاتا ہے، شاید ہی عمومی طور پر ہندوستان میں کہیں اور ہوتا ہو۔ اس تحریک کی کامیابیوں وکامرانیوں کو دیکھ کر آدمی ششدرہ رہ جاتا ہے کہ جس عمل کی بجا آوری حکومت کورٹ، عدالت اور پولیس محکموں کے ذریعہ کرتی ہے، کس طرح ایک عالم ربانی نے چند نفوس قدسیہ کے تعاون سے محض دین اور قوم کی محبت والفت کی بنیاد پر کر دیا۔ معاصرین میں سے جو حضرات آپ کے کارناموں سے واقف تھے، وہ آپ کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور آپ کا بے پناہ اعزاز واکرام کرتے تھے۔

چنانچہ بقیۃ السلف حضرت مولا محمد احمد صاحب نور اللہ مرقدہ کی خانقاہ میں جب کبھی آپ جاتے، تو حضرت آپ کی بہت عزت کرتے اور احترام سے اپنی جگہ بیٹھنے کا حکم کرتے، مگر ادباً کبھی آپ ان کی جگہ نہ بیٹھتے، بارہا ہوا کہ آپ خانقاہ میں گئے تو حضرت نے موجود لوگوں سے فرمایا: مولانا آگئے ہیں، کسی کو کوئی مسئلہ دریافت کرنا ہو تو معلوم کر لے۔

ایک مرتبہ آپ کا قیام مولاناؒ کی خانقاہ الہ آباد میں ہوا، تو حضرتؒ نے باقاعدہ آپ کے لئے چارپائی منگوائی، چارپائی حضرت کی چارپائی سے چھوٹی ملی، تو حضرت ناراض ہوئے اور خدام سے کہا کہ اینٹ وغیرہ لگا کر اس کو میری چارپائی کے برابر کرو، جب یہ سب کروالیا، تب حضرت اپنی چارپائی پر گئے۔

آپ کے انہی کارناموں سے متاثر ہو کر ۱۹۷۳ء میں شاعر اسلام جناب ڈاکٹر تابش مہدی صاحب نے ایک طویل نظم مولانا کی منقبت میں کہی، جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اہل حق کو مطمئن پاتا ہوں، تیرے کام سے
اہرمن کی فوج تھراتی ہے، تیرے نام سے
ظلمت باطل ہوئی کافور تیرے نور سے
روشنی تجھ کو ملی ہے گویا کوہِ طور سے
دین کو چمکا رہا ہے موضع اوگئی پور سے
روشنی پھیلا رہا ہے موضع اوگئی پور سے
تجھ سے خوش اہل وفا ہیں تجھ سے خوش شاہ زمن
خلد میں مسرور تجھ سے روح محمود الحسنؒ
آرزو قاسم کی یعنی علم کا قاسم ہے تو
یاد مدنیؒ آتی ہے سن سن کے تیری گفتگو
ذکر قرآن وحدیثِ پاک تیرا کام ہے
خدمت اسلام ہی کی فکر صبح وشام ہے

یار کی یاری سے پیدادین داری ہوگئی
آب یاری باغ دیں کی سب کو پیاری ہوگئی
ذرہ خاکی تیرے پرتو سے اختر ہوگیا
تیری تابش سے دل تابش منور ہوگیا

آپ کے احباب:

انجمن اصلاح المسلمین میں حضرت مولانا محمد احمد صاحب اور حضرت مولانا منیر احمد صاحب کی ذات گرامی سرپرستوں جیسی تھی اور حضرت مولاعبدالقدوس صاحب اعظمی مولانا کے معاصر اور جگری دوست تھے، ان بزرگوں کا مستقل تذکرہ آچکا، ان کے علاوہ انجمن اصلاح المسلمین کا تذکرہ جن چند اصحاب کے بغیر ناقص ہے، ان میں سے چند نمایاں نام یہ ہیں:

منشی ابراہیم صاحب ٹکری، منشی رحم علی صاحب جھواراِ، ماسٹر دلمیر صاحب ڈھکوا، وکیل محمد اسرار صاحب پرڑی، ملا مصلح الدین صاحب سرائے بابو، حاجی رمضان علی صاحب پلٹن بازار شہر پرتاپ گڑھ۔

منشی محمد ابراہیم صاحب ٹکری:

منشی محمد ابراہیم صاحب گاؤں ٹکری کے رہنے والے تھے، اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ مگر مطالعہ بہت وسیع تھا۔ سلیم الفکر، تدبر کا سرمایہ جیب میں رکھتے، دماغ فراست سے لبریز اور قلب شجاعت سے معمور، طلاقت لسانی اور قوت گویائی نے آپ کی شخصیت میں ایک عجیب کشش پیدا کردی تھی، آپ کی ذات سے انجمن اصلاح المسلمین کو بڑا فروغ ہوا۔ حاجی رمضان علی صاحب ذہناً وفکراً آپ ہی کے شاگرد تھے۔

منشی رحم علی جھوارا:

منشی رحم علی صاحب گاؤں جھوارا کے رہنے والے تھے، وہ انجمن اصلاح المسلمین کے بانیوں اور بے لوث خادموں میں تھے، پیشے سے اسکول میں ماسٹر تھے، اردو، فارسی

اور ہندی میں درک تام رکھتے تھے،قوم میں دینی تعلیم کو عام کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، ملا مصلح الدین صاحب آپ کے شاگرد تھے۔منشی جی نے خود اپنے صاحبزادوں کو عالم دین بنایا،آپ نے ''تذکرۃ القریش والافغان'' نامی ایک کتاب بھی تصنیف فرمائی،جس پر حضرت مولانا منیر صاحب کا مقدمہ اور حضرت مولانا محمد یار صاحب کی تقریظ تھی۔

ماسٹر دلمیر صاحب ڈھکوا:

ہر جماعت اور تحریک میں کچھ ایسے خاموش مزاج اور گمنام لوگ ہوتے ہیں، جو تمام تر کارناموں کے باوجود اپنے کو مخفی رکھتے ہیں، ماسٹر دلمیر صاحب انہی صفات کے حامل لوگوں میں تھے، گاؤں ان کا ڈھکوا تھا اور پیشہ سے سرکاری ماسٹر تھے،قوم میں تعلیم کو عام کرنے میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔انجمن کے اصلاحی کاموں کو مؤثر بنانے اور اس کے پیغام کو دور دور تک پہونچانے میں سرگرم رول ادا کیا، خاص کر پردہ اور نقاب کی تحریک میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔آپ کے صاحب زادے حاجی شہاب الدین صاحب مولانا کے دست راست تھے۔

وکیل حاجی محمد اسرار صاحب:

محمد اسرار خان ایڈوکیٹ رام پور پڑری کے رہنے والے تھے۔وہ اگرچہ عالم نہ تھے، تاہم اللہ نے انہیں ذہن وفکر کی جو بالیدگی عطا کی تھی اور ان کے سینے میں قوم وملّت کا جو درد تھا، وہ آج کے دور میں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ پرتاپگڈھ کی کوئی بھی علمی و مذہبی تاریخ ان کے تذکرے کے بغیر ناقص رہے گی۔

ملا مصلح الدین صاحب:

ملا جی موصوف سرائے بابو کے رہنے والے تھے، مڈل تک کی تعلیم حاصل کی ۔ پیشہ سے ماسٹر تھے،اور دینی وملی کاموں میں خوب پیسہ خرچ کرتے۔آپ نے سید محمد امین نصیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا تھا۔اس علاقہ میں حضرت کا قیام آپ ہی کے گھر ہوا کرتا تھا۔اس لئے ہوش وہواس میں انہیں دیکھا اور سنا تھا۔آپ ہی نے اپنے گھر پر اصلاح

المسلمین کا وہ اجلاس بلایا تھا،جس میں تمام اکابر شریک تھے، اور مولانا محمد یار صاحب کو بحیثیت قائد سب نے تسلیم کیا۔آپ کو مولانا کی ذات سے بہت عقیدت تھی، چنانچہ وضع قطع،لباس اور رہن سہن ہر چیز میں وہی طریقہ اختیار کرتے، جو مولانا کا ہوتا،اپنے اکلوتے فرزند کو عالم دین بنایا اور ایک مدرسہ کی بنیاد بھی رکھی۔۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئے۔طویل عمر گزار کر آسودۂ خواب ہوئے۔

وکیل حاجی رمضان علی صاحب:

حاجی رمضان علی صاحب اسلامی اخوت، دینی ہمدردی، دور اندیشی،مومنانہ فراست اور سیاسی سوجھ بوجھ کے حوالہ سے پرتاپ گڑھ کے ممتاز وقد آور لیڈر کا نام ہے۔خان بہادر رکن الدین کے بعد پرتاپ گڑھ کی مسلم قیادت حاجی صاحب ہی کے ارد گرد رہی۔ایک عرصہ تک جمعیۃ علماء پرتاپ گڑھ کے صدر، انجمن تعلیمات دین کے جنرل سکریٹری اور گانگریس پارٹی کے ضلع صدر رہے۔رام پور بھا انٹر کالج اور ابوالکلام آزاد انٹر کالج کے بانیوں میں تھے،فتنہ کے زمانہ میں مدرسہ نورالاسلام کنڈا کے دفاع میں آپ کی خاموش مگر مؤثر خدمت اہم کارنامہ ہے۔

راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے ساتھ دیندار،نمازی، پرہیزگار اور ذکر واذکار کے پابند تھے، بیعت کا شرف شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی سے تھا۔انھوں نے پوری زندگی علماء ومشائخ سے وابستہ رہ کر گزاری،حضرت مولانا محمد احمد پھولپوری، مولانا منیر احمد اور مولانا محمد یار صاحب سبھی سے قریب تھے۔علاقہ میں آپ مولانا محمد یار صاحب کے وکیل ومشیر خاص کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے۔دینی،سماجی، واصلاحی تمام کاموں میں آپ مولانا کے دست راست ہوا کرتے۔پلٹن بازار کی جامع مسجد کو اصلاح المسلمین کا صدر دفتر بنانے میں آپ کا بڑا کردار تھا۔پیشہ سے آپ وکیل اور سیاسی لیڈر تھے، جس کی وجہ سے وکلاء، دانشوروں اور دیگر سماجی وسیاسی لوگوں تک اصلاح المسلمین کی آواز پہنچانے میں آپ کا اہم کردار تھا۔

آپ کی پیدائش ۱۹۳۵ء میں گاؤں برسنڈا میں ہوئی،بچپن میں ہی سایۂ پدری سے

محروم ہو گئے اور پرورش، تعلیم و تربیت کی ذمہ داری والدہ کے ذمہ آئی، جسے انھوں نے بحسن وخوبی نبھایا۔ ماسٹر دلمیر کی سرپرستی میں مڈل پاس کیا۔ سوتیلے بھائی قمرالدین و عزیزالدین کی محنتوں کے بدولت الہ آباد یونیورسٹی سے بی، کام اور ایل، ایل، بی کی ڈگری حاصل کی۔ ۳۱/ اکتوبر: ۲۰۱۱ء میں انتقال ہوا۔ رحمھم اللہ جمیعا۔

قیام مدارس ومکاتب کی تحریک:

حضرت مولانا محمد یار صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا علاقے میں دوسرا سب سے اہم اور بنیادی کارنامہ قیام مدارس و مکاتب کی تحریک ہے۔ اسلامی تعلیم کے حوالہ سے یہ علاقہ انتہائی پسماندہ تھا۔ عالم وحافظ ڈھونڈ ھنے سے ملتے تھے۔ جنازہ اور نکاح کیلئے کسی عالم کا مل جانا، قسمت کی بات تھی۔ مولانا کے علاقہ میں ''امیر میاں'' نام کے ایک فقیر ''پہاڑ پور'' سے آتے تھے، وہی جنازہ پڑھاتے اور نکاح بھی۔ اگر وہ نہ ہوتے تو ان کا انتظار ہوتا، ورنہ بعض دفعہ میت کو بغیر نماز جنازہ ہی دفن کرنا پڑتا۔

حضرت مولانا محمد یار صاحب نے اس مصیبت کو دور کرنے، دینی تعلیم کو عام کرنے اور قوم کے بچوں کو علم دین سے آراستہ کرنے کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا۔ خود بھی مدرسہ قائم کیا، دوست احباب، اعزہ واقارب سے بھی مکاتب ومدارس قائم کروائے۔

اصل بات یہ ہے کہ آزادئ ہند: ۱۹۴۷ء کے ایک سال بعد حکومت ہند نے تمام ہندوستانیوں کے لئے درجہ پانچ تک جبریہ تعلیم کا قانون پاس کر دیا۔ ہمارے اکابر خصوصاً حضرت مدنی علیہ الرحمہ اور مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ وغیرہ نے مسلمانوں کے حق میں اس قانون کے مضر اثرات کو محسوس کرلیا اور اسکے خلاف جمعیۃ العلماء کے اسٹیج سے تحریک چلانے کا فیصلہ کیا۔

چنانچہ جمعیۃ العلماء نے ۱۹۵۴ء میں باقاعدہ بمبئی میں ایک اجلاس طلب کیا۔ جس میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: دینی تعلیم اور اس کی اشاعت یوں تو مسلمانوں کے لئے ہر زمانہ میں تمام ضروریات سے اعلی سمجھی گئی ہے، مگر انڈین یونین (بھارت) میں وہ انتہائی درجہ کو پہونچ گئی ہے۔ سیکولر اسٹیٹ میں مسلمانوں کا مستقبل محفوظ

رہ سکتا ہے تو صرف دینی مدارس ہی کے زیادہ سے زیادہ اجراء اوران کی ترقیات سے محفوظ رہ سکتا ہے۔اس لئے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس میدان میں اپنی جدو جہد کو تیز تر کردے۔(دینی تعلیمی تحریک اوردستورالعمل)

اصلاح معاشرہ کی بابت گوآپ کے پیشرووآئیڈیل مجددملت حضرت مولانا سیدامین نصیرآبادیؒ تھے،کہ جن کے منہج اورطریقہ اصلاح کوآپ نے اپنایااورترقی دی۔مگر قیام مکاتب ومدارس کی بابت آپ کے پیشرووآئیڈیل آپ کے شیخ ومرشدشیخ الاسلام مولانا سید حسین احمدمدنی تھے۔

آپ نے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی فکراورسوچ پر کام کوشروع کیا۔اور پورے علاقہ میں مکاتب کا جال بچھادیا۔اس زمانہ میں آپ کواس کی بابت ایک جنون سا تھا کہ جہاں،جس گاؤں،اورجس علاقہ میں جاتے اور وہاں اسلامی و دینی تعلیم کا کوئی بندوبست نہ ہوتا،تو پوری کوشش کرتے کہ کسی نہ کسی طرح وہاں ایک مکتب یامدرسہ کی بنیاد پڑجائے۔''ڈھیمہ'' کے حاجی افضل صاحب مرحوم کے پاس بڑی دولت تھی،مگر کوئی نرینہ اولادنہ تھی۔مولانا محمد یارصاحب سے بات ہوئی توآپ نے حاجی صاحب کومدرسہ قائم کر نے پرآمادہ کیااور''دارا پور'' مدرسہ کی بنیاد ڈالوادی۔

''ہرہر پور'' کے حکیم صدیق صاحب مرحوم، جوسسرالی رشتے سے آپ کے عزیز تھے،ان کو دفینہ میں ایک بڑی رقم دستیاب ہوئی،اس کے مصرف کے سلسلے میں آپ کے پاس مسئلہ آیاتوآپ نے فرمایا کہ اس کا سب سے اچھامصرف یہ ہے کہ آپ اپنے گاؤں میں ایک مدرسہ قائم کردیں۔حکیم صاحب مرحوم اس کے لئے تیار ہوگئے،دن اورتاریخ طئے ہوئی، پھرآپ اپنے احباب مثلاً ملاابرہیم پچورا کے ہمراہ''ہرہر پور'' گئے اور مدرسہ کی بنیاد ڈال دی۔

خوداپنے گاؤں میں ایک مدرسہ قائم کیا، ملا مصلح الدین صاحب سے''سرائے بابو' میں مدرسہ قائم کروایا،خان محمد یونس اورمستری عبدالغنی سے''سونپور'' کامدرسہ کھلوایا۔ملانور محمد سے''پیارے کے پوروا'' کامکتب قائم کرایا،''ڈھکوا''میں حاجی شہاب سے ایک مکتب

کی بنیاد ڈلوائی، ملا ابراہیم سے تیج گڑھ میں مکتب کھلوایا، ''لال گنج'' میں حاجی ریاض سے مکتب کی بنیاد ڈلوائی۔

الغرض پورے علاقہ میں مکاتب ومدراس قائم کرانے میں آپ نے ممکن حد تک محنت کی۔ خلصہ سادات، رام پور بجھا، کٹلیا، جہان پور، دباہی، بھلیا پور، رانی گنج اجگرا اور سہودر پور، نیز دیگر علاقوں میں مکاتب آپ کی اسی محنت اور لگن کی یادگار ہیں۔ ان مکاتب میں سے کچھ تو آگے چل کر اچھے مدارس کی شکل اختیار کر گئے اور کچھ نامساعد حالات کے پیش نظر بند ہوگئے۔ آپ کے انہی کارناموں سے متاثر ہوکر شاعر اسلام محمد یوسفؒ نے آپؒ کی منقبت میں ایک طویل نظم کہی، جس کے چند اشعار یہ ہیں ۔

محمد یار مولانا ہی کی، بس ایک ہستی ہے
بدولت جن کی یاں پر رحمت مولیٰ برستی ہے
یہی حضرت ہیں جو کہ پہنچنے والے ہیں ساحل کے
یہی حضرت ہیں، جو معمار ہیں اس قوم جاہل کے
یہ قوم ایسی تھی بگڑی جارہی تھی خود کو کھونے کو
کہ پیدا ہو گئے حضرت ہیں حق کا بیج بونے کو
نمازیں تک پڑھانے کو امام ان کو نہ ملتا تھا
فقیروں اور منہاروں سے ہی کچھ کام چلتا تھا
نکاحوں کے پڑھانے کو تلاش ان کو تھی قاضی کی
خوشامد تھے کیا کرتے یہ ملا اور غازی کی
بڑی مشکل تھی ان کو اپنی میت کے جنازے میں
تمیز ان کو نہ تھی کچھ غلاظت اور غازہ میں
عقیقہ اور قربانی جو کر لیتا وہ قاضی تھا
نہیں بنتا ہے کہتے جس نہج پر دین جاری تھا

کہ اس مرد مجاہد نے ہی کھولا مکتب اسلامی
ازالہ رسم بد ہو اورنا باقی رہے خامی
ہیں ہم ممنون حضرت کے مرادوں کی بھرے جھولی
سبھی ہی گاؤں میں بنتی جارہی ہے حفاظ کی ٹولی
کئی علماء بہت سے حافظین دین بنایا ہے
بڑی ہی جانفشانی سے دین کا حق نبھایا ہے

نام، ولادت اور خاندانی احوال:

آپ کا نام ''محمد یار'' والد کا نام ملاّ محمد عمر ابن عبد الکریم عرف بُھوال میاں ابن رمضان ابن عبد السبحان ابن غلام محمد تھا۔ وطن گاؤں اوگئی پور موضع گھری ہے۔ آپ تین بھائی تھے، جن میں آپ سب سے چھوٹے تھے۔ پیدائش ۱۹۲۴ء میں ہوئی۔ آپ کے والد ملاّ محمد عمر صاحب، سید محمد امین نصیر آبادیؒ کے متوسلین میں تھے۔ نیک سیرت و نیک صورت، با اخلاق انسان تھے۔ کھیتی باڑی اور گھر کے کام سے فراغت کے بعد ذکر الٰہی و عبادت خداوندی میں مصروف رہتے۔

دادا عبد الکریم عرف بھوال میاں پابند صوم وصلوۃ اور احکام شریعت کی بجا آوری کرنے والے تھے، ساتھ ہی بڑے جری اور بہادر بھی۔ پڑھے لکھے زیادہ نہیں تھے، البتہ جتنا جانتے تھے اس پر سختی سے کاربند رہتے۔ فوج میں ملازم تھے اور عمدہ کارکردگی کی بنیاد پر آپ کو ایک بڑی جاگیر گاؤں جٹھوارہ سے جانب جنوب ''جہان پور'' میں ملی تھی۔ اس کے علاوہ اور بھی زمینوں کے آپ مالک تھے۔ گھر کی عورتیں باحجاب اور نمازی تھیں۔ اس لئے انھوں نے اپنے پورے باغ میں ''مہوے'' کے درخت نہیں لگوائے کہ اس کو چننے کے لئے عورتوں کو باغ میں جانا پڑتا ہے۔ اور یہ کام وہ اپنے گھر کی عورتوں سے نہیں کروا سکتے تھے۔

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ''کہ ہندوستان دار الحرب ہو چکا ہے'' سے آگاہی کے بعد آپ نے فوجی ملازمت ترک کردی اور ہندوستان دار الحرب سے ہجرت کرنے کا ارادہ کر لیا۔ آپ کی ایک پھوپھی یمن کے شہر ''عدن'' میں رہا

کرتی تھیں اور بڑی خوشحال تھیں؛ مگران کے کوئی نرینہ اولاد نہ تھی؛ بار باران کا بھی تقاضہ تھا کہ عبدالکریم ہجرت کر کے یہیں آجائیں اور اقامت اختیار کرلیں۔فوجی ملازمت کو خیر باد کہہ دینے کے بعد دادا نے ''عدن'' (یمن) ہجرت کرجانے کا عزم مصمم کرلیا۔ یہاں کی جائیداد چھوڑ اور اعزہ واقرباء کو خیر باد کہہ کر آپ بغرض ہجرت سفرحج پر روانہ ہوگئے۔

اس زمانہ میں حج پر جانے کے لئے بادبانی کشتیاں چلا کرتی تھیں، جو بعض دفعہ سمندر میں بھٹک کر یا طوفان کی زد میں آکر غرق آب ہوجایا کرتیں، یا ایک طویل زمانہ کے بعد منزل مقصود کو پہنچتیں، آپ کی کشتی کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا، سمندر کے ایک زبردست طوفان نے کشتی کا رخ موڑ دیا اور کشتی راستے سے بھٹک گئی، ایک طویل زمانہ تک کشتی سمندر میں بھٹکتی رہی۔حجاج کرام کے خوردونوش کی اشیاء ختم ہوگئیں اور جانوں کے لالے پڑ گئے۔دادا جان دیکھنے سے ہی نیک اور صالح معلوم ہوتے تھے۔اس لئے اہل کشتی نے آپ سے درخواست کی کہ اگر آپ سب کو جمع کر کے اللہ سے دعاء کرائیں تو امید ہے کہ اللہ ہم لوگوں کا بیڑا پار لگادے۔آپ نے سب لوگوں کو جمع کیا اور خوب گڑگڑا کر اللہ سے دعاء مانگی۔دوسرے دن صبح لوگوں نے آسمان میں پرندوں کو اڑتے دیکھا، اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ایک ساحل بھی نظر آگیا اور لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

''مَکلاَّ ۃ'' نامی یہ علاقہ حضرموت کا ساحلی اور مرکزی شہر ہے، وہاں کے فوجیوں نے کشتی کو محاصرہ میں لے لیا اور تحقیق وتفتیش کی؛ پھر وہاں کے حکمران کے حکم پر ان لوگوں کو سرکاری مہمان خانہ میں ٹھہرایا گیا۔بادشاہ نے ان حجاج کا اعزاز واکرام کیا اور کہا کہ موسم حج گزر چکا؛ اب آپ لوگ آئندہ موسم ہی میں فریضۂ حج ادا کر سکتے ہیں۔آپ حضرات ہمارے مہمان ہیں؛ سکون واطمنان کے ساتھ یہیں قیام کیجئے؛ آئندہ موسم حج پر آپ حضرات کو میں خود مکّہ مکرمہ بھیج دونگا، البتہ مناسب ہوگا کہ جب تک یہاں قیام پذیر ہیں، اپنے آپ کو کسی کام میں مصروف رکھیں؛ اس سے ہمارا تعاون ہوتا رہے گا۔

دادا مرحوم فن سپہ گری کے استاد تھے؛ چنانچہ آپ وہاں فوجیوں کی تربیت پر مامور ہوگئے۔دوسرے سال موسم حج پر امیر نے حسب وعدہ ان لوگوں کو شاہی اعزاز واکرام

کے ساتھ مناسک حج کے لئے مکہ مکرمہ روانہ کر دیا۔ دادا حج سے فارغ ہو گئے، مگر سمندر کے ہولناک مناظر، دوستوں اور رفیقوں کی اموات اور ایک طویل زمانہ کے پر مشقت سفر نے طبیعت کو مضمحل کر کے رکھ دیا تھا، ادھر معلوم ہوا کہ عدن میں ایک وبا پھیلی ہوئی ہے اور وہاں جانا مناسب نہیں ہے؛ چار و ناچار آپ نے ہجرت کے ارادہ کو ترک کر دیا اور ساتھیوں کے ہمراہ وطن واپس آ گئے۔

تعلیم و تربیت:

ابتدائی تعلیم کا آغاز گاؤں ''باسوپور'' کے سرکاری اسکول سے ہوا۔ اس وقت سرکاری اسکولوں میں اردو زبان ہی ذریعہ تعلیم تھی۔ غالباً درجہ پانچ تک کی تعلیم وہیں حاصل کی۔ اسی دوران میاں فتح محمد شکوہ آبادیؒ کے پاس ناظرہ قرآن شریف پڑھتے۔

حضرت مولانا سیّد امینؒ نصیر آبادی کے بعد، علاقہ میں اصلاحی دورہ پر حضرت مولانا محمد سعیدؒ صاحب نصیر آبادی تشریف لایا کرتے تھے؛ وہ یہاں آئے ہوئے تھے اور ''ہنڈور'' کی جامع مسجد میں بیان تھا؛ مولانا نے دوران تقریر لوگوں سے سوال کیا کہ سب سے اچھا انسان کون ہے؟ مجمع میں سے کسی نے کوئی جواب نہ دیا؛ اتنے میں مولانا نے جو ابھی چھوٹے بچے تھے اور اپنے والد کے ہمراہ جمعہ کی نماز کے لئے ہنڈور گئے تھے؛ بول پڑے کہ ''سب سے اچھا انسان وہ ہے جو اللہ کو پہچانتا ہو۔'' مولانا سعید صاحبؒ اس جواب سے بے انتہا خوش ہوئے اور فرط مسرت سے آپ کو چمٹا لیا۔ بعد میں والدین کو راضی کیا اور انہیں علم دین سکھانے کے لئے اپنے ہمراہ نصیر آباد لے گئے۔

نصیر آباد میں طویل زمانہ تک قیام رہا۔ تکمیل حفظ کے بعد ایک مرتبہ رمضان میں حضرت الاستاذ نے کہا کہ محمد یار! آج تم جتنا سنانا چاہو، سناؤ۔ میں سننے کے لئے تیار ہوں۔ قرآن بہت اچھا یاد تھا، چنانچہ آپ نے پڑھنا شروع کیا اور چوبیسویں پارے پر پہلا رکوع کیا، چھ پاروں کی تکمیل بقیہ انیس رکعت میں کی۔

اطاعت دیانت اور وفاداری فطرتاً طبیعت میں تھی؛ جس نے آپ کو استاذ کی نظر میں محبوب ترین شاگرد بنا دیا تھا؛ چنانچہ دوران قیام آپ ان کے گھر کے ایک فرد کی مانند

تھے، گھر کی ساری ذمّہ داری آپ کے سپرد ہوتی؛ حتّٰی کہ زمین وجائداد کے ذمہ دار بھی آپ سمجھے جاتے؛ علاقہ میں حضرت الاستاذ کی زندگی میں ہی ان کے نائب کی حیثیت سے جانے، پہچانے جانے لگے. نصیر آباد میں تقریباً دس سال قیام رہا؛ اس اثناء میں آپ طالب علم بھی تھے؛ حضرت الاستاذ کی عدم موجودگی میں ان کے قائم مقام اور مدرس وامام بھی۔

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ:

حضرت الاستاذ نے قیام نصیر آباد کے زمانہ ہی میں درس نظامی کی کچھ کتابیں پڑھادی تھیں، مزید تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند کا قصد کیا۔ اور مولانا سعید صاحب ہونہار شاگرد کو اپنے ہمراہ لئے دیوبند گئے اور شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے دامن تربیت سے وابستہ کرآئے۔

دارالعلوم میں داخلہ ہوگیا اور تعلیم شروع ہوگئی، تاہم کسی وجہ سے ایک سال کے لئے شیخ الاسلامؒ کے مشورہ سے رڑکی حضرت مولانا عبدالرؤوف صاحب پشاوریؒ کے پاس چلے گئے۔ دوسرے سال دارالعلوم دیوبند آئے اور وہاں کی علمی وروحانی فضا میں رہ کر خوب کسب علم وفیض کیا۔

آپ نے ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۹۵۰ء میں دورہ حدیث شریف سے فراغت حاصل کی۔ بخاری شریف اور ترمذی شریف شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمدؒ مدنی سے پڑھی، مسلم شریف اور طحاوی شریف علامہ ابراہیم بلیاویؒ سے، ابوداود اور شمائل ترمذی شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی امروہویؒ سے، نسائی اور ابن ماجہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ صاحب سے، جبکہ موطا امام مالکؒ اور موطا امام محمدؒ کو مولانا ادریسؒ کاندھلویؒ سے۔

بیعت وسلوک:

زمانۂ طالب علمی میں ہی اپنے استاذ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمدؒ مدنی کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے اور علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی سے بہرہ ور ہونے لگے۔ آپ کا شمار حضرت مدنی کے خصوصی خادموں میں تھا۔ حضرت مدنیؒ کی مجلس میں سبھی لوگ آپ کو ''حافظ جی'' کے نام سے پکارتے تھے۔ ارشاد وہدایت کے اس میدان میں بھی

آپ نے تیز گامی سے سفر شروع کیا اور فراغت سے پہلے ہی ذکر قلبی وغیرہ کا معمول بن گیا۔ حضرت مدنیؒ کے آپ خلیفہ مجاز تو نہ تھے، لیکن اجازت تو بہ آپ کو حضرت سے حاصل تھی۔

وطن واپسی کے بعد یہاں کی دینی واصلاحی ذمہ داریاں بڑھ گئیں، انہیں نبھانے کی تگ ودو میں آپ رات دن ایک کئے ہوئے تھے کہ آپ کو ''کنٹھ مالا'' کے موزی مرض نے آدبوچا۔ جس نے آپ کو ایک طویل زمانہ تک بستر استراحت پر رہنے کے لئے مجبور کر دیا۔ ٹھیک اسی زمانہ میں شیخ واستاذ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سفر آخرت پر روانہ ہوگئے، رحمہ اللہ تعالی رحمۃ واسعۃ۔

دیو بند میں طالب علمی کے زمانہ میں مولانا محمد یار صاحب کے ایک ساتھی مولانا عبداللہ صاحبؒ متوفی ۲۰۰۵ء، گاؤں مانجھا، ضلع گوپال گنج، کے رہنے والے تھے۔ انتہائی متواضع اور سادہ طبیعت، صاحب کشف وکرامات بزرگ تھے، حضرت مدنی قدس سرہٗ نے آپ کو زمانۂ طالب علمی ہی میں خرقۂ خلافت سے سرفراز فرمادیا تھا۔

صحت مند ہونے کے بعد جب مولانا محمد یار صاحب کو شیخ کی جستجو ہوئی اور چاروں طرف نظر دوڑائی، تو آپ کی نظروں میں صرف انہی مولانا عبداللہ صاحبؒ کی ذات گرامی بھائی۔ چنانچہ آپ نے مولانا سے اس سلسلے میں درخواست کی، اولاً انکار کیا مگر اصرار پر رجوع کرلیا اور بعد میں خلافت واجازت سے بھی سرفراز کیا۔

شیخ عبداللہ صاحب ایک زمانہ تک دیو بند میں مقیم رہے تھے، ایک مرتبہ مشہور ناقد وادیب، مفسر قرآن مولانا کاشف الہاشمی آپ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ میں آپ سے بیعت ہونا چاہتا ہوں، مولانا نے فرمایا کہ: کل تک تم میرا مذاق اڑایا کرتے تھے، آج بیعت کے لئے کیسے آگئے؟ انھوں نے کہا کہ میرا نفس بہت شریر ہوگیا ہے، میں نے چاہا کہ اس کو ایسے شخص کے حوالہ کروں، جسے یہ سب سے زیادہ ذلیل سمجھتا ہے۔ حضرت نے کہا ٹھیک ہے، تشریف رکھئے۔ پھر خود وہاں سے اٹھ کر مولانا ہاشمی کے چہیتے شاگرد حضرت مولانا ریاست علی بجنوریؒ کے پاس گئے، انہیں لیکر آئے اور فرمانے لگے: یہ تمھارے استاذ کو کیا ہوگیا ہے، کہ بیعت کے لئے ایسے شخص کا انتخاب کیا ہے، جو ان کی

نظروں میں سب سے زیادہ ذلیل ہے۔ان کو یہاں سے لے جایئے، بیعت کے لئے عقیدت کی ضرورت ہوتی ہے۔

مولانا عبداللہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ شاگرد و مسترشد کا کمال یہ نہیں ہے کہ استاذ اور شیخ اس سے محبت رکھے۔ بلکہ کمال یہ ہے کہ طالب اپنے شیخ و استاذ سے محبت رکھے۔ ابوطالب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت چاہا، لیکن فائدہ نہیں ہوا۔ فائدہ ان صحابہ کو ہوا جنھوں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جان و دل سے چاہا۔

تدریسی زندگی:

فضیلت کے بعد شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کے حکم سے قصبہ محمدی کھیری لکھیم پور میں تدریسی خدمت انجام دی، وہاں سے دوبارہ نصیرآباد آ گئے، پھر وطن پرتاپ گڑھ منتقل ہو گئے۔ وطن میں اولاً مدرسہ ''باب العلوم'' بابوگنج، پھر ''حفظ العلوم'' ڈروا، میں خدمت انجام دی۔

اوگئی پور مدرسہ کی بنیاد اس طرح ڈالی کہ زمانۂ طالب علمی سے ہی آپ کا معمول رہا تھا کہ ایام تعطیل میں گھر آتے تو علاقہ کے بڑے بوڑھوں اور بچوں کو جمع کر انہیں قرآن پڑھاتے۔ مگر ۱۹۵۲ء میں اپنی فراغت کے بعد ہی آپ نے گاؤں ''ناگاپور'' میں اپنے دادا پیر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے نام پر ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور اس میں میاں عظیم اللہ باسوپوری (شاگرد مولانا الیاس کاندھلوی) اور میاں سکندر تلوری کو استاذ مقرر کیا۔ بعد میں اسی مدرسہ کو گاؤں اوگئی پور میں منتقل کیا گیا۔ میاں عظیم اللہ اور میاں سکندر کے بعد اس مدرسہ میں منشی اقبال صاحب اور منشی مقبول صاحب مدرس ہوئے اور تادم آخر خدمت انجام دیتے رہے۔

یوں تو آپ کو درس نظامی میں تفسیر و حدیث پڑھانے کا اتفاق نہ ہوا، مگر آپ کا علمی استحضار بے نظیر تھا، آیت کا جو مطلب، حدیث کی جو توجیہ اور مسئلہ کا جو حکم بتا دیتے وہ حرف آخر ہوا کرتا۔ آپ کے زیر مطالعہ اکثر تفسیر قرآن، حدیث، فقہ اور دیگر اسلامی کتب مثلاً: حجۃ اللہ البالغہ، احیاء العلوم، مولانا نانوتوی کی آب حیات، مولانا روم کی مثنوی اور حضرت

تھانوی کی کتابیں رہا کرتی تھیں۔مثنوی کے نہ جانے کتنے ابواب اور فصلیں زبانی یاد تھیں،جنہیں گنگناتے رہتے تھے۔دورہ حدیث شریف میں صحاح ستہ کی تقریریں خصوصاً شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر بخاری اور ترمذی مکمل قلمبند کی تھی۔

شادی اور نکاح:

آپ نے دو نکاح کئے، پہلا عقد زمانہ طالب علمی ہی میں گاؤں ''جوگاپور'' کی ایک نیک خاتون سے ہوا تھا، ان کا انتقال ہوگیا تو دارالعلوم دیوبند سے فضیلت کے بعد دوسرا نکاح گاؤں ''پتئی پور'' کے ملاشیر علی (جو حضرت مولانا سید امین نصیرآبادیؒ کے متوسلین میں تھے،ان) کی دختر نیک،آیت کریمہ:''**المحصنات المومنات الغافلات**'' (پاکدامن، بھولی بھالی، ایمان والیاں) کی سچی تفسیر ''ام امین'' سے ہوا۔(جوالحمدللہ آج بھی باحیات ہیں:۸/نومبر ۲۰۲۲ء) ان کے بطن مبارک سے کل :۱۷/اولادیں ہوئیں،جن میں سات لڑکے اور دولڑکیاں بقید حیات ہیں،سبھی عالم وحافظ ہیں، مزید تین بچوں نے آپ کا دودھ پیا،اور آپ کی رضاعی اولاد ہوئے،الحمدللہ یہ لوگ بھی حافظ قرآن ہیں۔اس طور پر آپ کے بارے میں بلاشبہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جس بچے نے بھی آپ کا دودھ پی لیا، وہ آگے چل کر حافظ قرآن ضرور ہوا۔

مولانا کے انتقال کے وقت آپؒ کی صلبی اولاد میں گیارہ عالم اور تیس حافظ قرآن موجود تھے، جب کہ دونوں داماد بھی حافظ وعالم ہیں۔**فالحمد للہ علی ذلک۔**

آپ نے اپنی تمام اولاد کو عالم دین اور حافظ قرآن بنانے کا اللہ سے عہد کرلیا تھا اور اسے پورا کیا۔شروع شروع میں جب آپ کے بڑے لڑکے مولانا محمد امین صاحب دیوبند سے فضیلت حاصل کرکے واپس آئے،تو آپ کے کئی خیر خواہوں مثلاً حاجی رمضان علی صاحب نے آپ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ کچھ بچوں کو دنیاوی علوم بھی پڑھا دیجئے کہ اس سے معاشی احوال درست ہو جائیں گے،ان حضرات نے تعلیم کا پورا خرچ برداشت کرنے کا ذمہ بھی لیا۔مگر آپ نے بہت سختی سے اس تجویز کو رد کیا اور کہا کہ میں نے اللہ سے

وعدہ کیا ہے کہ اپنے تمام بچوں کو عالم بناؤں گا، میں اپنے وعدے کا ایفا کر کے رہوں گا۔ پہلے یہ عالم ہو جائیں، پھر اس کے بعد جس کو جو پڑھانا ہو، لیجائیے پڑھائیے، مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

درمیان میں ایک مرتبہ طبیعت اتنی خراب ہوئی کہ آپ زندگی سے مایوس ہو گئے، اس وقت آپ نے اپنے شاگرد و رفیق کار منشی مقبول صاحب سے وصیت کی کہ: ''بیٹا میری زندگی کا بھروسہ نہیں ہے، خدانخواستہ اس مرض میں اگر میرا انتقال ہو جاتا ہے، تو تم میرے عہد کو پورا کرنے کی کوشش کرنا، میرے تمام بچوں کو عالم دین بنانا۔

آخری ایام میں بطور تحدیث بالنعمۃ کے آپ فرماتے کہ ''میں نے قوم کے لئے فکر کی تو اللہ تعالیٰ نے ساری دولت میرے گھر جمع کر دی''، یعنی علماء وحفاظ پیدا کر دئے۔ **ذالک فضل اللہ یو تیہ من یشاء**۔ فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحبؒ کشمیری سابق شیخ الحدیث دار العلوم وقف دیوبند نے بجا طور پر فرمایا ہے کہ:

''یہ خانوادہ علمی امتیازات کا دیدہ زیب گہوارہ ہے''۔ (علم الاحکام)

سخاوت:

اللہ تعالیٰ کے انعاموں میں سے آپ پر ایک عظیم انعام یہ تھا کہ آپ کو مال اور پیسہ سے محبت نہ تھی، ادھر پیسہ آیا نہیں کہ ادھر خرچ ہو گیا، جب تک آپ زندہ رہے نہ جانے کتنے غریبوں اور ضرورت مندوں کا تعاون کرتے رہے۔ جب بھی نیا کپڑا سلاتے پرانا کسی نہ کسی ضرورت مند کو دیدیتے۔ سردیوں میں نئی جاکٹیں خرید وا کر ضرورت مندوں میں تقسیم کرتے۔ پیسہ رکھنا یا آگے کیلئے جمع کرنا آپ جانتے ہی نہ تھے، زندگی بھر بینک کی کوئی کاپی آپ کے نام سے نہیں بنی اور دنیا سے اس حال میں رخصت ہوئے کہ مقروض تھے۔ زندگی بھر جب سے آپ نے گھر کی ذمہ داری سنبھالی کوئی نہ کوئی فقیر، غریب، مجبور و بیکس شخص آپ کے دروازے پر رہا ہے، بہتوں کا تو جنازہ بھی آپ ہی کے دروازے سے اٹھا۔ وفات کے وقت بھی دو ایسے لاچار و مجبور شخص آپ کے یہاں مقیم تھے جن کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ مہمانوں کی آمد پر خوش ہوتے، ان کی ضیافت میں ممکن حد تک تکلف

فرماتے، کھانے کے وقت اکثر و بیشتر دسترخوان پر مہمان ہوتے۔

شجاعت اور بہادری:

قدرت کی فیاضیوں نے مولانا مرحوم کے قلب و دماغ میں ایسی اسلامی ہمدردی رکھ دی تھی کہ وہ فقط مدرسہ یا خانقاہ تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھ سکتے تھے، آپ کی ہمت اور جرأت ہر اس محاذ پر آپ کو لا کھڑا کر دیتی جس میں مسلم قوم اور اسلام کا فائدہ نظر آتا، آپ ہر محاذ اور ہر مورچہ پر اسلام کے دفاع کے لئے پہنچ جاتے۔

(۱) شہر پرتاپ گڑھ کی پلٹن بازار کی مسجد میں آپ تراویح پڑھاتے، اس کے بعد سائیکل کے ذریعہ گھر اوگئی پور واپس آتے تھے۔ پلٹن بازار سے آپ کا مکان تقریباً ۲۶ رکلومیٹر کی مسافت پر ہے۔ ایک دن اچانک شہر میں ایک شور ہوا اور افواہ یہ اڑی کہ ایک مسلم علاقہ پر غیر مسلموں نے حملہ کر دیا ہے۔ لوگ سہم گئے اور محفوظ مقام کی تلاش میں کچھ لوگوں کو جاتے ہوئے دیکھا گیا۔ آپ نے لوگوں کو جمع کیا قرآن کی ایک آیت پڑھ کر ایک ایسی بلیغ اور موثر تقریر کی کہ جو لوگ ابھی سہمے تھے، وہ لڑنے اور مرنے کے لئے تیار نظر آئے۔ تیار ہو کر اس علاقہ کے لئے نکلنے ہی والے تھے کہ اتنے میں مولانا منیر صاحبؒ یغمانی (جو ادھر ہی سے آرہے تھے) نے خبر دی کہ کچھ نہیں ہوا ہے، ہندو لوگ ہولی کی آگ جلائے ہوئے ہیں۔ حملہ وغیرہ کی خبر غلط ہے۔

(۲) اندرا گاندھی نے فیملی پلاننگ کی تحریک چلائی تو آپ نے کھلم کھلا اس کی مخالفت کی اور اس کی تردید میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اس کی وجہ سے آپ اور مولانا عبد القدوس صاحب پولیس اور خفیہ ایجنسی کی نگاہ میں آگئے تھے، مگر اللہ نے آپ حضرات کو محفوظ رکھا۔

(۳) رانی گنج اجگرا کے قبرستان میں ایک غیر مسلم بابا بشکل مسلم آیا، اور جھاڑ پھونک و تعویذ گنڈوں کا کام کچھ ایسا چلایا کہ یہاں کے بعض مسلمان بھی اس کے معتقد ہو گئے۔ آپ کی نگاہ دوربین نے اس کی حرکات وسکنات کو دیکھ کر سمجھ لیا، کہ وہ کون ہے اور اس کا کیا مقصد ہے۔ آپ نے اس کے طرز عمل کی مخالفت کی، مسلمانوں کو اس کے پاس جانے سے منع کیا اور اس کو یہاں سے بھگانے پر کمر بستہ ہوئے۔ رانی گنج جا کر ایک پروگرام کیا اور

وہاں کے لوگوں سے اپیل کی کہ اس فریبی کو یہاں سے زبردستی نکال بھگائیں۔ چنانچہ ایک دن اس کو وہاں سے جانا پڑا۔ بعد میں وہ جونپور میں گرفتار ہوا اور تفتیش سے معلوم ہوا کہ وہ غیر مسلم ہے، اس کی بعض تعویذات میں خنزیر کے بال بھی ملے۔

دیانت:

دیانت داری انسان کا سب سے اعلیٰ جوہر ہے اور مسلمان کی اصل پہچان یہی ہے۔ مگر بعض ایسے مقام اور احوال انسانی زندگی میں آتے ہیں کہ وہاں دیانت اور امانت پر ثابت قدم رہنا انتہائی مشکل ہی نہیں تقریباً ناممکن ہوجاتا ہے، خصوصاً جب کہ معاملہ اپنے عزیز یا رشتہ دار کا ہو۔ ارشاد باری ہے ''**انما اموالکم و اولادکم فتنۃ**'' (تمہاری اولاد اور تمہارے مال تمہارے لئے آزمائش ہیں) اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسے مشکل اور دشوار حالات میں بھی دیانت و امانت پر ثابت قدمی کی توفیق دی۔ دارالعلوم دیوبند میں داخلہ مشکل سے ہوتا ہے، خوش نصیب حضرات ہی اس ادارہ صافی سے سیرابی حاصل کر پاتے ہیں۔

آپ کے ایک صاحب زادے مولانا محمد نسیم صاحب قاسمی کا دارالعلوم دیوبند میں داخلہ ہوگیا، دارالعلوم کے ضابطے کے مطابق سابقہ مدرسے کا تصدیق نامہ داخل کرنا ضروری تھا، مشکل یہ تھی کہ مولانا نسیم صاحب مدرسہ اشرف العلوم گنگوہ سے پڑھ کر آئے تھے، وہاں کے مہتمم صاحب ہفتم یا ششم پڑھے بغیر اپنے مدرسے کا تصدیق نامہ نہیں دیا کرتے تھے اور یہ درجہ اول یا دوم ہی میں آ گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے داخلہ فارم میں گنگوہ کے مدرسے کا نام نہ لکھ کر اپنے ''مدرسہ رشیدیہ اوگئی پور'' کا نام لکھ دیا کہ باپ اس کے مہتمم ہیں، تصدیق نامہ بآسانی مل جائے گا۔ داخلہ کے بعد دارالعلوم میں اعلان آ گیا کہ جدید طلبہ جلد سے جلد تصدیق نامے جمع کردیں، عدم تعمیل حکم کی صورت میں نام خارج کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اور بڑے بھائی مولانا محمد امین نے اپنے والد مولانا محمد یار صاحب کے نام ایک خط لکھا جس میں اس غلط اقدام کی ناگزیریت کو تفصیل سے بیان کرکے درخواست کی کہ اپنے مدرسہ اوگئی پور سے تصدیق نامہ بھیج دیں تو داخلہ برقرار رہے گا، ورنہ

نام خارج ہو جائے گا۔مولانا مرحوم نے بیٹوں کو جو جواب لکھا وہ ملاحظہ ہو! ''اولاً تم لوگوں نے مدرسہ کا غلط نام کیوں ڈالا۔نام تم کو صحیح ڈالنا تھا، میں مولانا شریف مہتمم اشرف العلوم گنگوہ سے تمہارے لئے تصدیق نامہ حاصل کرا دیتا۔اب جب کہ تم نے یہ حرکت کی ہے تو تم جانو تمہارا کام، چاہے داخلہ ختم ہو، چاہے رہے، میں ہرگز اپنے مدرسہ سے تمہارے لئے تصدیق نامہ نہیں بھیج سکتا ہوں۔''

عبادت

عبادت خصوصاً نماز میں خشوع وخضوع کا اتنا اہتمام کہ اس صفت پر نماز ادا کرنے والوں کی تعداد معدوم نہیں تو انتہائی قلیل ضرور ہے. اولا انتہائی اہتمام سے مسواک و وضوء کرتے، پھر انتہائی خشوع وخضوغ اور تعدیل ارکان کے ساتھ نماز مکمل کرتے، اور اس حوالے سے کسی ہنگامی صورتحال سے کبھی متاثر نہ ہوتے تھے۔کبھی امامت کرتے تو اس خوش الحانی سے قرات کرتے کہ مقتدیوں پر رقت طاری ہو جاتی۔آپ پرشکوہ بارعب آواز کے ساتھ انتہائی خوش الحان قاری تھے۔

تہجد سے فراغت کے بعد وظائف کا معمول تھا۔وظائف میں ۲۴:ہزار مرتبہ اسم اعظم کا ورد، پاس انفاس، درود، استغفار اور تلاوت قرآن کے دو تین پارے اس پر مستزاد شامل تھے۔ ذکر جہری کے وقت بلا مبالغہ آپ کی آواز پانچ سو میٹر فاصلہ تک جاتی اور سارے علاقہ کو منور کر دیتی۔رمضان میں تو عبادتوں کی شان ہی الگ ہوتی، ادھر جمادی الثانی وشعبان کا مہینہ شروع ہوتا، ادھر قرآن سنانے کا اس قدر اہتمام بڑھ جاتا کہ سننے والے تھک جاتے۔آپ دیکھ کر تلاوت کے عادی نہ تھے۔بس کسی نہ کسی کو سنا کر تشابہ دور کر لیتے تھے۔ یہ ماہ شعبان کا معمول تھا۔رمضان میں سفر کی مصروفیتوں کے باوجود کئی پارے یومیہ پڑھتے، جبکہ تہجد میں تنہا ایک یا دو قرآن ختم کرتے۔آپ کا یہ معمول آخری عمر تک رہا، حتی کہ وفات کے سال جب طبیعت زیادہ خراب تھی اور کھڑے ہو کر پڑھنے کی ہمت نہ رہی تو بیٹھ کر نماز تہجد میں ایک قرآن ختم کیا۔

اتباع سنت و کرامت:

مولانا محمد یار صاحب اتباع سنت کے اتنے حریص تھے کہ آپ کے عمل کو دیکھ لوگ فیصلہ کرلیا کرتے تھے کہ یہی طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رہا ہوگا۔ وہ ادنیٰ سی ادنیٰ چیز میں بھی کوشش کرتے کہ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق ہو۔ ایسی معمولی اور غیر اہم چیزیں جن کی جانب عموماً نظریں نہی جاتیں، اس میں بھی وہ طریقۂ سنت کو ملحوظ رکھتے۔ مثلاً: ''کرتا'' کا وہ حصہ جس میں کاج بٹن ہوتا ہے، اس کا بایاں حصہ اوپر ہوتا ہے، اور وہی سامنے ہوتا ہے، یعنی افضل جگہ ہوتا ہے، جبکہ داہنا حصہ نیچے چھپا ہوتا ہے، یعنی مفضول ہوتا ہے، حالاں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر چیز میں دائیں کو مقدم رکھتے تھے۔ چنانچہ مولانا محمد یار صاحب اس میں بھی طریق سنت کی رعایت کرتے اور اپنے ٹیلر سے کہتے کہ بیٹا میرے کاج والے حصہ کو جو نظر آتا ہے اس کو اوپر رکھنا۔

کسی کے گھر کی بنیاد رکھتے تو کہتے کہ اسے قبلہ رخ بناؤ، نماز پڑھنے اور قبلہ تلاش کرنے میں آسانی ہوگی۔

یہ تو اتباع سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حال تھا۔ البتہ آپ سے کچھ ایسی خارق عادت چیزوں کا بھی ظہور من جانب اللہ ہوا ہے کہ اسے آپ کرامت کے علاوہ کوئی اور نام نہیں دے سکتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ آپ کو ایک ایسے شخص کے جنازے میں شرکت کرنی تھی جو آپ کو بہت عزیز تھا۔ مگر گرمی اور لو اس قدر کہ گھر سے باہر نکلنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا گاؤں آپ کے گھر سے تقریباً آٹھ نو کلومیٹر کی دوری پر تھا۔ اللہ کا نام لیکر گھر سے نکل پڑے۔ ابھی چند ہی فرلانگ چلے ہوں گے کہ ایک چھوٹا سا بادل آکر آپ پر سایہ فگن ہوگیا، اور وہ ادھر ہی کو جاتا، جدھر آپ کو جانا ہوتا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر کافی دیر تو آپ کو یقین نہ آیا، مگر جب وہ مسلسل سایہ فگن رہا، تو سمجھ گئے کہ یہ ہم پر سایہ کیے ہوئے ہے۔ آپ فرماتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں جو پڑھتا کہ آپ پر بادل سایہ فگن رہا تو اس پر یقین تو تھا، البتہ کیفیت کے بارے میں سوچتا تھا کہ کیسے وہ چلتا رہا ہوگا، سو اس دن اس کا مشاہدہ ہوگیا۔

اسی طرح ایک بڑھیا تھی جس کے صرف ایک ہی اکلوتا لڑکا تھا، وہ فوج میں ملازم تھا۔ ہندوستان نے اپنی کچھ فوجیں تمل ٹائیگروں سے لڑنے کے لئے بھیجنے کا فیصلہ کیا، اس میں اس لڑکے کا بھی نام آ گیا۔ اس کی ماں روتی اور بلکتی ہوئی مولانا کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ وہاں لڑائی چل رہی ہے، میرا بچہ مار دیا جائے گا۔ آپ اسکی حفاظت کے لئے کچھ کیجئے! آپ نے کہا کہ میں اس میں کیا کرسکتا ہوں؟ بعد میں آپ نے اسکو کچھ لکھ کر دے دیا اور کہا: اسے لیجاؤ، اس میں اللہ کا نام ہے، ان شاء اللہ اس کی برکت سے تمہیں راحت ملے گی۔ ابھی دو ہی تین دن گذرے ہوں گے کہ خبر ملی: کہ چند فوجیوں کے ایک دستہ کو واپس ملک لوٹا دیا گیا، انہی میں اس لڑکے کا نام بھی تھا۔

مرض الموت ووفات:

زمانہ بڑھا، مشیت ایزدی کا رخ پلٹا اور جو زبان پون صدی سے اصلاح وتبلیغ، اشاعت دین اور احیاء سنت کا فرض ادا کر رہی تھی، اس کے بند ہونے کا حکم آ گیا۔ اللہ کے علاوہ سب کو فنا ہے، باقی، دائم اور قائم رہنے والی ذات تو صرف اللہ تعالیٰ کی ہے ''کل من علیھا فان، ویبقی وجہ ربک ذو الجلال والاکرام''۔

ایک رات خواب دیکھتے ہیں کہ دو شخص آپ کے سرہانے آکر بیٹھ جاتے ہیں اور (گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) عرض کرتے ہیں کہ حضرت اب اس جھوپڑی کو چھوڑ کر سامنے والے (شاندار) محل میں چلنا ہے، فرمایا ٹھیک ہے، میں چلنے کے لئے تیار ہوں، مگر تنہا نہیں چلوں گا، اپنے بچوں کو بھی ساتھ لے چلوں گا۔ تعبیر بالکل ظاہر تھی۔

اب آپ زیادہ تر اپنے اوقات تسبیح وتمجید ''سبحان اللہ والحمدللہ ولاالہ الا اللہ واللہ اکبر'' میں گذارتے تھے۔ اور اکثر یہ اشعار گنگناتے رہتے:

مجھکو تری جستجو مجھکو تیری تلاش ہے
خالق مرے کہاں ہے تو، مجھکو تیری تلاش ہے
دریا وکوہ سار میں، وادی وآبشار میں
ڈھونڈھوں جو مرغ زار میں سنبل میں تار تار میں

پتوں میں گل میں خار میں مجھکو تیری تلاش ہے
گل میں مثال بونہاں بیٹھا ہے چھپ کے تو کہاں
چھانا ہے میں نے کُل جہاں مجھکو تیری تلاش ہے
سورج میں کیا ہے جلوگر تاروں میں کس کا ہے اثر
ڈھونڈھوں کہاں میں بے خبر، مجھکو تیری تلاش ہے
خالق میرے کہاں ہے تو مجھکو تیری تلاش ہے

ہارنیہ کا مرض پہلے ہی سے تھا، مثانے میں ٹومر کا دوسرا موذی مرض ہو گیا، جس کی وجہ سے آپریشن ناگزیر تھا۔ حسب پرگرام الہ آباد میں آپریشن کرایا گیا۔ کچھ افاقہ ہوا تو اسپتال سے گھر آ گئے۔ مگر آپریشن کامیاب نہ تھا۔ اس نے آپ کو بالکل کمزور و لاغر کر کے رکھ دیا۔ بعد میں علالت عجیب سنگین نوعیت اختیار کر گئی۔ دوبارہ پھر الہ باد لایا گیا، اسپتال ہی میں اہل خانہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ:

''بچو! میرے پاس اللہ کی دو امانتیں تھیں، ایک زندگی اور دوسری اولاد، میں نے اپنی پوری زندگی راہ خدا میں صرف کر دی اور تم لوگوں کو بھی علم دین ہی پڑھایا۔ اب تم سب کو اللہ کے حوالہ کرتا ہوں۔ بلاوا آ گیا ہے، اب میں اپنے اللہ سے ملنے والا ہوں اور ان (اللہ) سے پیارا کوئی نہیں ہے۔''

وفات سے تین دن پہلے اپنی اولاد کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

''دیکھو! حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علیہما السلام نے اپنی اولاد کے لئے جو وصیتیں کی تھیں، وہی میں بھی تم لوگوں کو کرتا ہوں۔ پھر فرمایا!

۱- دین حنیف پر مضبوطی سے قائم رہنا۔

۲- سنت نبوی کو مضبوطی سے پکڑے رہنا۔

۳- فرائض کو کبھی ترک نہ کرنا۔

۴- سب بھائی بہن آپس میں مل جل کر رہنا۔

۵- آپسی اتحاد و تعلق کو باقی رکھنے کے لیے اپنے بچوں کا ایک دوسرے کے یہاں

نکاح کردینا۔

۵-عورتوں میں پردے کا خاص خیال رکھنا۔

۶-میری قبر میرے والدین کی قبروں کے پاس بنانا۔

۷-اس پاگل بڑھیا (اپنی والدہ محترمہ) کا خیال رکھنا اور میرے دونوں چھوٹے بچوں (احمد و محمد) کا خیال رکھنا۔

اسپتال میں دوران قیام ہندو ڈاکٹروں کو دیکھ کر چیں بجبیں ہو جاتے، اور مسلمان ڈاکٹر آتا تو اس کو دیکھ کر چہرا کھل اٹھتا۔

۱۶رصفر المظفر ۱۴۲۵ھ مطابق ۷راپریل ۲۰۰۴ء بروز بدھ کی صبح ایک عجیب سی بے چینی طاری ہوئی، اس وقت آپ نے کہا کہ اب مجھے گھر لے چلو۔ ابھی گاڑی کا انتظام ہو ہی رہا تھا کہ آخری وقت شروع ہو گیا، اپنے بچوں کو حکم دیا کہ قرآن پڑھو اور خود اللہ اللہ کرنے لگے، جب آواز بند سی ہونے لگی تو ہونٹھوں کو ہلا کر لفظ ''اللہ'' ادا کرتے۔ اسی حالت میں گھر لانے کے لیے گاڑی پر لٹا دیا گیا، شہر الہ آباد سے نکل کر گاڑی دریائے گنگا کے پل پر پہنچی ہی تھی کہ اسی حالت میں علم و فضل، جہد و عمل، ورع و تقوی، سادگی و انکساری اور خشیت و انابت کا یہ پیکر، حق گوئی و بے باکی کا علمبردار، سلوک و تصوف کا تاجدار، صبر و ثبات اور دعوت و عزیمت کا پیکر، حقیقتوں کا آشنا اور جنوں کے اس راز دار نے دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کر دیا۔ **انا للہ و انا الیہ راجعون**

دوسرے دن بے نظیر ہجوم اور انسانی بھیڑ نے آپ کی نماز جنازہ میں شرکت کی اور تدفین عمل میں آئی۔

چہرے پر عجیب قسم کی مسکراہٹ تھی۔ نماز جنازہ سے پہلے منہ قبلہ رخ ہونا شروع ہوا اور جب قبر میں لٹایا گیا تو رخ بالکل جانب قبلہ تھا، حسب وصیت گھر کے سامنے والے قبرستان میں آپ کے والد صاحب کی قبر سے متصل قبر بنائی گئی۔ وہاں سے کتنوں نے قرآن پاک پڑھنے کی آواز سنی اور متعدد مرتبہ پوری قبر روشن اور قمقہ زار پائی۔ **رحمہ اللہ رحمۃ واسعہ**

آپ کے انتقال پر بہت سے لوگوں نے مرثئے کہے، ایک مرثیہ نعیم صاحب عزیز حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتا بگڈھیؒ کا قطعہ کی صورت میں تھا:

جس کی خوشبو سے معطر ہو گئے قرب وجوار
دین حق کا وہ گل وگلزار رخصت ہو گیا
نور سے جس کے علاقہ ہو گیا روشن نعیم
وہ مربی وہ محمد یارؒ رخصت ہو گیا

حضرت مولانا نسیم اللہ صاحب مظاہری نے طویل مرثیہ کہا، جس کے کچھ اشعار پیش خدمت ہیں:

عاشق علم حدیث ذوالمنن ۞ اُسوۂ اخلاق نبوی زیب تن
علم دیں کے ایک بحر بیکراں ۞ ہر قدم پر راہ دیں کے پاسباں
عاجزی رفتار میں گفتار میں ۞ خندہ پیشانی ہر اک کردار میں
ذکر اور تسبیح ان کی جان تھی ۞ ہَر بُنِ مُو میں اسی کی شان تھی
گفتگو میں نور ایماں کی چمک ۞ شوکتِ اَسلاف کی ان میں جھلک
انکساری عاجزی ان کی ادا ۞ روح ان کی پیکرِ صبرو رضا
قول ان کا ایک پتھر کی لکیر ۞ کر نہیں پایا کوئی اس پر نکیر
غمگسار بیکس ونادار تھے ۞ ہر پریشاں حال کے غمخوار تھے
اہل باطل کے لئے شیرِ ببر ۞ اہل حق کے واسطے گلہائے تَر
قوم وملّت کے لئے بے چین تھے ۞ جس طرح کہ سرورکونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے
دین پر فِتنہ اگر آیا نظر ۞ چل پڑے حق کی لئے تیغ وسپر
حق پہ آنچ آئے یہ ممکن ہی نہ تھا ۞ جان جائے یہ انہیں منظور تھا
نیک صورت، نیک سیرت آپ تھے ۞ ایک دریائے سخاوت آپ تھے
اولیاء وصوفیاء کے جانشیں ۞ بیشتر رہتے تھے وہ گوشہ نشیں
شمع دیں گھر گھر جلانا چاہتے ۞ شرک وبدعت کو مٹانا چاہتے

پرچم توحید لہراتے رہے ۞ معرفت کا نور پھیلاتے رہے
صحن گلشن جو یہ لالہ زار ہے ۞ حسن مولانا محمد یار ہے
آہ وہ نوری بشر رخصت ہوا ۞ وارث خیر البشر رخصت ہوا
اس کے اٹھنے سے یتیمی چھا گئی ۞ اس کی فرقت قوم کو تڑپا گئی
اس کی تربت نور سے معمور ہو ۞ اس کا جلوہ رشک کوہ طور ہو

ربنا تقبل منا، انک انت السمیع العلیم
وتب علینا انک انت التواب الرحیم۔
وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقہ محمد
وعلی آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین
برحمتک یا ارحم الراحمین۔ (آمین)

محبوب الٰہی محمد قاسمی پرتاپ گڑھی
۱۱/رجب ۱۴۴۴ھ، ۳/فروری ۲۰۲۳ء
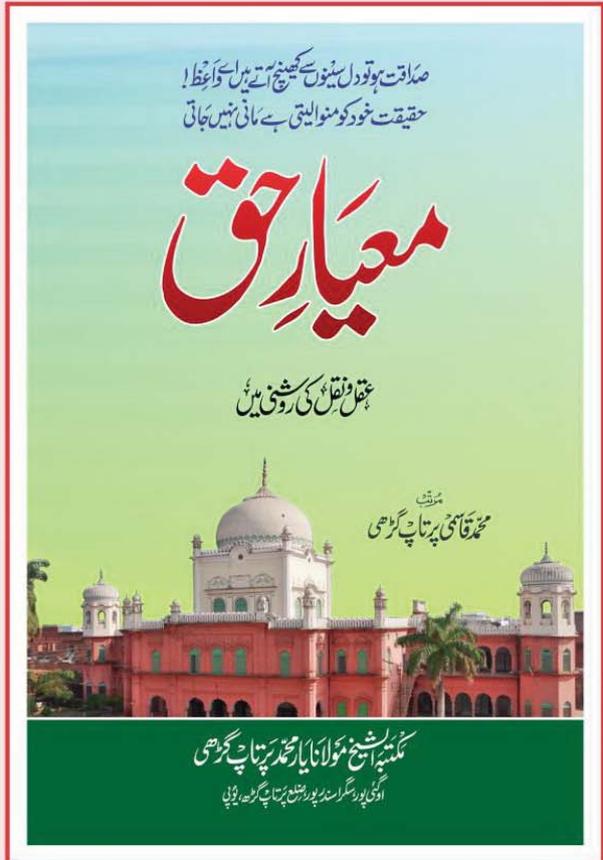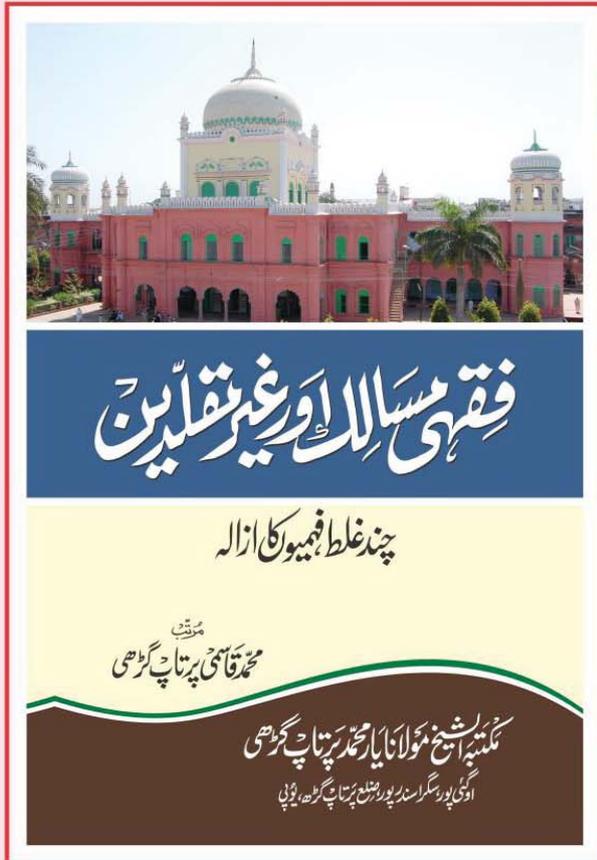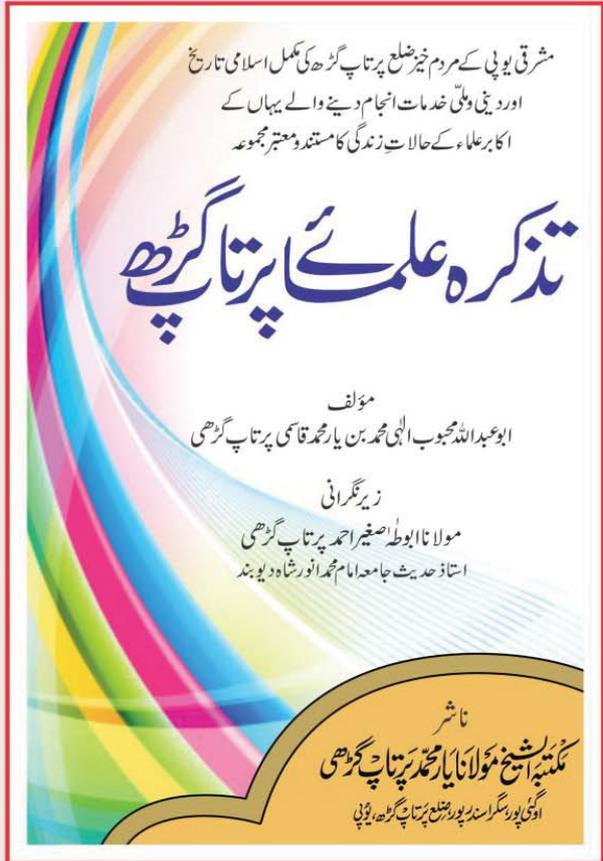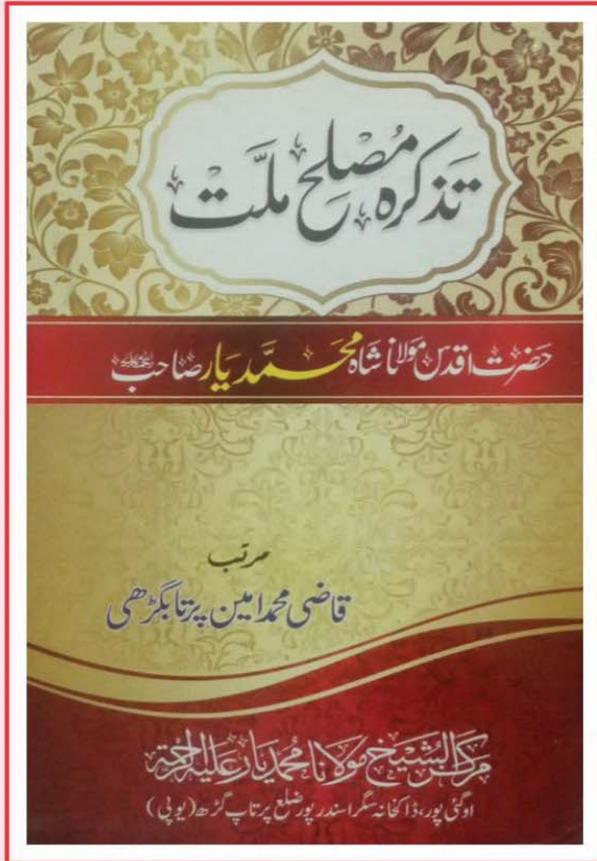
Markazush Shaikh Molana Md. Yaar
Maulana Nagar, Ugaipur, Sagra Sundarpur
Distt. Pratapgarh (U.P.) Mob. 9766163919